جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر

تصنیف

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جسے

رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے

عصمت بک ایجنسی دہلی سے شائع کیا

جون ۱۹۳۷

چھٹی مرتبہ

یادگارِ مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ

رسالہ عصمت دہلی

ہندوستان بھر کے تمام زنانہ اخبارات و رسائل میں سب سے اچھا اور سب سے زیادہ چھپنے والا مشہور و معروف باتصویر ماہوار رسالہ ۴۰ سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ عصمت ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور ملک کی بہترین لکھنے والی خواتین کے اعلیٰ درجہ کے مضامین ۸۰ صفحوں پر ہر ماہ شائع کرتا ہے۔ عصمت ہی وہ رسالہ ہے جو صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے شریف بیگمات کے لیے ہندوستان کا چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا ہے۔

سالانہ چندہ چار روپے (للعہ)

رسالہ بنات دہلی

حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ نے ۱۹۲۴ء میں یہ ماہوار رسالہ مسلمان لڑکیوں کے لیے جاری فرمایا تھا۔ اس سال میں اس کا کسی ایک ماہ کا پرچہ بھی ایک دن کی تاخیر سے شائع نہیں ہوا۔ عصمت کی طرح بنات بھی پابند وقت ہے۔ لڑکیوں اور بچیوں کے لیے بہترین مضامین سبق آموز نظمیں۔ مزیدار کہانیاں شائع کرتا ہے۔ زبان اتنی آسان کہ گیارہ برس تک کی بچیاں سمجھ سکتی ہیں۔

سالانہ چندہ ڈیڑھ روپیہ

نمونہ مفت

فخرِ نسواں ہند محترمہ خاتون اکرم کی یادگار

جوہرِ نسواں دہلی

ہندوستان بھر میں زنانہ دستکاری کا واحد رسالہ ہے جس میں کشیدہ، کروشیا، جالی، تارکشی، کارچوب، ٹکینہ، کراس اسٹیچ، سلمہ ستارہ، ربن پٹی، کٹاؤ اور کپڑوں کی سلائی، کٹائی وغیرہ مختلف قسم کی زنانہ دستکاریوں کے عمدہ عمدہ نمونے اور مفصل ترکیبیں اور کارآمد ہدایتیں شائع ہوتی ہیں۔ جوہرِ نسواں کے مضامین پھوہڑ لڑکیوں کو بھی سگھڑ اور ہنرمند بنا دیتے ہیں۔ جوہرِ نسواں کی قلمی معاونین ہندوستان کی مشہور دستکار خواتین ہیں۔

سالانہ چندہ مع محصول عہ۔ فی پرچہ ۸

مینیجر عصمت و بنات دہلی

مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار

محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر

اللہ محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل یا عبادی الذین اسرفوا

علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ

ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا

انہ ہو الغفور الرحیم

بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی خوش خطی کا نمونہ

متعلق صفحہ ۱۶۴

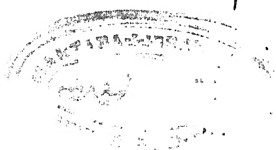
نوبت پنج روزہ



وداعِ ظفر

مصنّفہ

مصوّرِ غم علّامہ راشد الخیری رح



فہرست مضامین

دیباچہ

رات، مدتیں ہوئیں کہ ختم اور وہ سماں درہم برہم ہوا، پیاری پیاری صورتیں آنکھ سے اوجھل ہوئیں، اور ہنس مکھ چہرے قبروں میں جا سوئے۔ مگر صحبتِ شب کی یادگار ابھی کچھ داغ دل پر باقی ہیں، شمع بجھ چکی لیکن دھواں اٹھ رہا ہے۔ پھول مرجھا چکے مگر نکہت موجود ہے!

ہاں، اے سرزمین شاہجہاں آباد! کیا ہوئی وہ رات جس میں تو دلہن بنی، اور کہاں گئے وہ ہاتھ جنہوں نے تجھ کو لباس عروسی پہنایا۔ تیرا سہاگ اجڑ گیا، مگر تیرا رنڈسالہ ابھی اس چاند سی صورت کا نشان دے رہا ہے جس کو خاتمۂ شب نے خاک میں سلا دیا، تیری صورت بگڑ گئی، لیکن تیری بربادی ابھی اس نوشہر کا مرثیہ پڑھ رہی ہے جس نے تاجدارانِ مغلیہ کی لاج رکھی!

ہاں ہاں اے سرزمین شاہجہاں آباد! تیرا وہ رنگ روپ اور سج دھج جس نے دِل تڑپا دیئے آنکھ کے سامنے ہے۔ تیری سُریلی تانیں اور دلکش نغمے جنہوں نے قلب مسخر کئے اب تک کانوں میں بس رہے ہیں۔ آج ہُو کا میدان سہی مگر تیری خاک ایک ایک چمنستان کا پتہ

دے رہی ہے۔ عالم سنسان سہی لیکن اے جنت نشان تیری آن پر
قربان ہونے والے ابھی زندہ ہیں۔

آنکھ جو تماشے دیکھ چکی اُن کو کس طرح زبان پر لاؤں، اور دل جو لطف
اُٹھا چکا اس کا نقشہ قلم سے کیونکر کھینچوں! زبان کی کشتی اِس بحرِ ناپیدا
کنار میں خاموش ہے اور توسنِ قلم اِس وسیع میدان میں گنگ، مگر یہ بحرِ
متلاطم جو دل میں موجیں لے رہا ہے اور یہ چٹیل میدان جس کی وسعت
کا پتہ نہیں، کوئی دم کے مہمان ہیں۔ موت سر پر منڈلا رہی ہے اور
صیادِ اجل طائرِ روح کے قریب پہنچ چکا، دِل کی باتیں دل میں رہ
جائیں گی، اور وہ جواہرات جن کی چمک دمک سے اب تک آنکھیں
جھلمل جھلمل کر رہی ہیں جسدِ خاکی کے ساتھ دفن ہو جائیں گے۔ اِس لئے
دِل جس کو بچھڑنے والی صورتوں کے داغِ فراق نے لالہ زار بنا دیا،
تقاضہ کر رہا ہے کہ اُن کی آب و تاب سے احباب کو محروم نہ رکھوں،
اور موجودہ دنیا کو ایک جھلک اُن جواہر ریزوں کی دکھا دوں جو دیکھتے
ہی دیکھتے فنا ہو گئے۔

جانتا ہوں کہ دورِ حاضرہ کا ہر لمحہ ماضی پر لعن طعن کر رہا ہے۔
اور ان کافر اداؤں پر جن کی مشرق نے سدا پرستش کی حسنِ مغرب کا
تسلّط ہو چکا۔ برفستان کے سفید ڈھیروں نے اِس چمنستان کے
سانولے سلونے فالسوں کو تاراج کر دیا۔ شب ماہ کی بہاروں اور
صبا کے جھونکوں پر گیس کی روشنی اور برقی پنکھے غالب آ گئے، لیکن

دوستو! جہاں آج مصنوعی سبزہ سو رہا ہے، یہاں دامنِ کوہ سے اُٹھنے والی کالی کالی اور اودی اودی گھٹائیں جھوم جھوم کر برستی ہیں اور جس جگہ یہ روکھی پھیکی للی اور خالی خولی ڈیزی دکھائی دیتی ہے وہاں گلاب و موتیا لہک چکے ہیں!

آج فضائے آسمانی کے مناظر کتنے ہی پُر لطف اور روح افزا ہوں، مگر اِدھر دیکھو ان ٹیلوں کے غبار کا ہر ذرّہ داستانِ شب سُنا رہا اور کہہ رہا ہے۔ کہ یہاں آموں کے جھنڈ چھائے ہوئے تھے۔ گھن کی چھاؤں تھی۔ جھولے پڑتے تھے پینگیں بڑھتی تھیں، پھوار پڑتی تھی کڑھاؤ چڑھتے تھے، اور جو آنکھیں اس وقت سفید چادروں پر بھُنے ہوئے آلو اور اُبلے ہوئے گوشت دیکھ رہی ہیں، اُنہوں نے گرم گرم پھلکیاں اور بارہ مصالحے کی چاٹ کا سماں بھی دیکھا ہے۔

دورِ جہالت تھا یا ظلمت لیکن وضعداری کی شاداب بیلوں میں تعلقات کے ایسے سدا بہار پھول کھل رہے تھے کہ بوستانِ ہند ہزار سر پٹکے مگر وہ رنگ اب میسر نہ ہوگا۔ خلوص کی دیوی کا نتھرا ہوا صاف شفاف دودھ اُن کی گھٹی میں تھا، ملکۂ محبت کی آغوش میں پروان چڑھے، جوانی نے انسانیت کا سہرا سر سے باندھا۔ ضعیفی نے کامیابی کے پھول نچھاور کئے، شاد رہے، اور آباد گئے۔ ہشاش رہے اور بشاش چلے۔

قلم کی آنکھیں ان مقدس صورتوں کا خیال آتے ہی خون کے

آنسو روتی ہیں اور قلب مضطرب اس توقع سے آگے بڑھتا ہے کہ حسنِ عقیدت کے یہ کاغذی پھول اُن کے پاک مزاروں پر چڑھائے۔

خوشا نصیب سرزمین شاہجہاں آباد! تیری خاکِ پاک سے ایسے ایسے پھول مہکے جن کو خزاں آج تک نہ مرجھا سکی۔ تاجدارانِ مغلیہ کی وہ آخری ہستی جو ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کے پیکر میں نمودار ہوئی۔ آج گو ظاہری آنکھوں سے رنگون کی خاک میں آرام کر رہی ہے، مگر اس کے کام، اور اس کی باتیں، اس کے دن اور اس کی راتیں، ابھی جاگ رہی ہیں، توسنِ قلم اس کے نام کو بوسہ دیتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بساطِ حیات کا یہ روشن چہرہ پیادوں کی حراست میں بھی چشمِ بینا کو تاجداری اور جہاں تابی کی جھلک دکھا رہا ہے۔ اس کی فراخ حوصلگی جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار یاد دلا رہی ہے۔ بے تعصبی اور رعایا نوازی کی حسین پریاں اکبر اور اورنگ زیب کا کلمہ پڑھتی ہوئی رحم و کرم کے مورچھل ہلا رہی ہیں۔ یہ وہ نازک وقت ہے کہ شاہجہاں آبادی دلہن اُجڑ چکی۔ بیوگی کا ہولناک دیو منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑا ہے، دوست آشنا ایک ایک کر کے جدا ہوئے اور وہ روسیاہ جنہوں نے اس کے حنائی ہاتھوں کی بھیک سے پیٹ پالا، اس کی جان کے دشمن ہو گئے، چشمِ بینا ایسے قیامت خیز مناظر کم دیکھے گی۔ قلعہ معلّٰی کی چہل پہل، جہاں ہر چہار سمت حسن کے پرے جمے ہوتے تھے برباد ہو گئی۔ ننگی تلواروں کے پہرے میں۔ دیوزاد توپوں کے دہانے ہیں، اور جس جگہ

پرندہ پر نہ مار سکتا تھا وہاں آج کچھ اور ہی عالم ہے۔

ضعیف العمر بادشاہ! قربان تیری ہمت و استقلال کے، جوان بیٹے کا سر آنکھ سے دیکھا اور شکر کیا!! ظفر! تو وہ انسان تھا کہ انسانیت تیرے ساتھ ختم ہو گئی، آنکھیں تیری صورت ڈھونڈھ رہی ہیں اور دل تیری باتوں کو تڑپ رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آرزو کہ تیری قبر کو بوسہ دوں پوری ہو گی۔ مگر گہری گور میں سونے والے بادشاہ! عقیدت کے یہ چند پھول تیری اس قبر پر جو تخیل میں آنکھ کے سامنے ہے ادب سے پیش کرتا ہوں اور کہتا ہوں۔

بادشاہ! شاہجہاں آباد اُجڑ گیا!!

راشد الخیری

دہلی۔ دفتر عصمت
اگست سنہ ۱۹۲۴ء

تمہید

سیاحِ قلم تمام رات چمنستانِ حیرت میں مست و متوالا دیکھتا رہا کہ قلعہ معلّٰی کی زمین فردوس بریں بنی ہوئی ہے، مرمر دموسیٰ کے در و دیوار اور یادگارِ شاہجہانی کے نقش و نگار نے خاک کا ہر ذرّہ گلزار بنا دیا ہے۔ قمقموں نے رات کو بقعہ نور کر دیا۔ ادر جدھر نظر ڈالو روشنی ہی روشنی ہے۔ گنگا جمنی دیواریں، طلائی پچیکاری، زمردیں مینا ہر سمت جگ مگ جگ مگ ہو رہا ہے۔ موسم گرم ہے۔ مگر لالہ کی دمک، ہوا کی مہک اور اگن کی چہک جنت کا نمونہ دکھا رہی ہے چنبیلی، موتیا، بیلے اور جوہی نے کوسوں تک در و دیوار مہکا دئیے دیوان خاص دُلہن بنا جمنا کی گود میں کھڑا ہے۔ چاندنی اس کے قدموں میں لوٹ رہی ہے۔ دریا کی لہریں صاحبقران ثانی کا کلمہ پڑھتی ہوئی قلعہ معلّٰی کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہیں۔ ایک نور کا دریا ہے کہ ہر طرف لہریں لے رہا ہے۔ پھولوں میں بسے ہوئے ہوا کے جھونکے۔ فوّاروں کی پھوار، اِدھر درباریوں کی چہل پہل، ادھر مینا بازار، بیگموں کا غول جسولیوں کی ٹھٹول، مردوں

کے قہقہے، عورتوں کے چہچہے، غرض قلعہ کی زمین یورپ کا آسمان بنی ہوئی ہے۔ جہاں انقلاب چرخ بھی فرحت و انبساط کا پیش خیمہ ہے۔



مگر صبح صادق کا سماں متحیر سیاح کے ہوش اڑا دیتا ہے روتا ہے اور سر دھنتا ہے، جب دیکھتا ہے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا، انسان اگر عبرت کی داستان سننا چاہے، چشم بینا اگر انقلاب کا تماشہ دیکھنے کی خواستگار ہو تو قلعہ معلیٰ کے وہ اشجار دیکھے جو سرِ شام دھل دھلا اور نکھر نکھرا چوتھی کی دلہن بنتے تھے۔ آج جن سرسبز پتوں کو گرد و غبار کے تودے ٹھکرا رہے ہیں۔ غروب آفتاب سے قبل ان کی شاداب جبیں پر قمقموں کی افشاں ہوتی تھی۔ ایمان کی آنکھ اگر اس سرزمین پر پہنچکر ظاہری آنکھیں بند کرے اور دل کے آئینہ میں دیکھے تو معلوم ہو گا کہ جہاں خاک اڑ رہی ہے یہاں وہ لدے پھندے درخت موجود تھے جن کی طراوت آنکھوں میں گھُستی تھی اور یہ وہ تھے جن کو مملکتِ ہند کے اولوالعزم سلاطین نے اپنے ہاتھ سے سینچا۔

ہاں ہاں اجنبی سیاح دل پر ہاتھ رکھکر دیکھ، اور کلیجہ پکڑ کر سُن، جن ہرے بھرے درختوں پر آرہ چل رہا ہے اُن کی جڑوں نے شاہی ہاتھوں کا دودھ پیا ہے۔ یہ شاخیں جو سوکھ کر کھڑنک ہو گئیں ان کا پتہ پتہ تاریخ کا دفتر ہے۔ جو تنے پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستے

ا ہوئے، وہ خواتین مغلیہ کے نازک ہاتھوں کو بوسہ دے چکے ہیں!

معاشرت حاضرہ سے متاثر ہو کر آپ حق رکھتے ہیں کہ میرا اور
ہرے ساتھ ان واقعات کا مضحکہ اڑائیں، مگر قصرِ حیات کی یہ مستحکم
یاد اُن مبارک ہاتھوں کی ہے جن کی نیت خلوص میں ثمرا بورا ور
سانیت میں غرقاب تھی۔ انقلابِ معاشرت کی آندھی کتنے ہی زور
سے حملہ آور ہو یہ بار آور درخت اپنی جگہ سے سرکنے والے نہیں۔
ہری بھری ڈالیاں کیسی ہی بودی اور کتنی ہی نازک نظر آئیں، لیکن
ن گچھوں میں ایسے نشیمن آباد ہیں جن کے بسنے والے طائر اپنا نغمہ
روع کریں گے، تو اُن کی تانیں دلوں کے ٹکڑے اڑا دینگی یہ بہار سدا رہنے
لی نہیں، جس وقت آسمانِ تمدن پر انقلاب کی گھنگور گھٹا چھائی
رگی اور دورِ حاضرہ کے سفید بادلوں پر ابرِ سیاہ کا تسلط ہو جائیگا
ں وقت دیکھنا ان ہی کوئلوں اور پپیہوں کی یاد کلیجہ توڑ دے گی۔

پہلی نوبت

معمولی دن

پھولوں کی سیجوں پر اور کھرّی چارپائیوں پر امرا و غربا کی راتیں آتی اور جاتی ہیں، مگر دلّی کے بادشاہ کی رات دیکھنا کس شان سے آتی اور کس انداز سے جاتی ہے! آمد کا رنگ پھر دیکھنا یہ وداعِ شب کا منظر ہے۔ ابھی کائنات کا ہر ذرّہ نیند کی لپیٹ میں ہے۔ دریا کا پانی اور درخت کی پتیاں رات کے اس دورِ آخر میں ساکت ہیں، قلعہ معلّٰی کی دیواریں، موتی مسجد کے کنگرے خاموش ہیں۔ اور گرمی کی وجہ سے نیند کے متوالے تمام رات ٹھنڈی ہوا کو ترسے ہیں۔ خدا خدا کر کے اس وقت آنکھ لگی اور چشم زدن میں بے خبر ہو گئے قدرت کا ہاتھ ہوا کے جھونکوں میں لوریاں دے رہا ہے۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے کہ نیند کا جال پردۂ دُنیا پر پھیلا ہوا ہے۔ باردخانہ کے بالائی کمرہ سے بلبل ہزار داستاں کا نعرہ بلند ہوا، یہ شاہی اگن ہے جس کے گنگا جمنی پنجرے پر کارچوبی بستنی چڑھی ہوئی ہے۔ رات کے سنّاٹے میں اس طائرِ خوش الحان کا نغمہ جو وداعِ شب کا نشان ہے دِل ہلا دیتا ہے۔ اگن کی آواز سنتے ہی بہرام خاں گولنداز

کلمہ پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور توپ کی آواز نے مخلوق خدا کو صبح کی آمد کا پیام پہنچا دیا۔ موتی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ چیچی ٹکی والیاں شاہی مسہری پر حاضر ہوئیں اور آہستہ آہستہ پاؤں دبانے شروع کئے، بادشاہ بیدار ہوئے۔ حوائج ضروری سے فراغت پائی اور مسجد میں تشریف لاکر شریک نماز ہوئے۔ رعیت نماز پڑھ کر رخصت ہوئی تو رعیت کا بادشاہ اپنے وظیفہ میں مصروف ہوا۔ آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ بادشاہ مسجد سے باہر آئے۔ چاروں طرف مجرے والے کھڑے ہیں، درازیٔ عمر و ترقیٔ اقبال کے نعروں میں یہ انسانی ہستی ایوان فرحت میں داخل ہوئی، اصیلیں باادب گردن جھکائے کھڑی ہیں۔ وسط صحن میں ایک تخت قاقم و سنجاب سے آراستہ ہے جسولنی داروغہ دونوں ہاتھوں میں اطلسی بقچیاں لئے موجود ہے کہ غسل خانہ کے سردار نے آکر دست بستہ گردن جھکا دی۔ بادشاہ اُٹھکر غسل خانہ میں تشریف لے گئے۔ جونپوری کھلی، خوشبو کا بیسن، چنبیلی، شبّو، موتیا، بیلا، جوہی، گلاب کے تیل بوتلوں میں بھرے قرینہ سے رکھے ہیں۔ شتفابہ میں ایک طرف ٹھنڈا، ایک طرف گرم پانی ہے، چاندی کے لوٹے سونے کی لٹیاں جگمگا رہی ہیں۔ غسل سے فراغت پائی، اندر ہی اندر لباسی محل میں تشریف لائے، جہاں رستم بیگ سردار کے سوا کسی کو داخلہ کی اجازت نہیں، بقچے، بقچیاں، دست بقچے گٹھریوں کی قطاریں چُنی ہوئی ہیں۔ سردار نے لکھنؤ کی چکن کا کرتہ دونوں طرف ٹُکمے گھنڈیاں لٹھے کا

اک برا پاجامہ، دلی کا کمر بند پڑا ہوا جھک کر پیش کیا۔ بادشاہ نے کپڑے بدلے، مخملی کفش پاپیاں پہنیں، شمیم خانہ کا داروغہ حاضر ہوا۔ سر میں تیل ڈالا، بالوں میں کنگھی کی، کپڑوں میں عطر لگایا اور جہاں پناہ گلگشت کو باہر تشریف لائے۔

مغرب جس نے ہمیشہ مشرق کے خلاف زہر اگلا، تل کا پہاڑ اور میل کا بیل بنایا، شاہان مغلیہ کے سلسلہ میں رقمطراز ہے کہ دن بھر انیڈے تے اور رات بھر سوتے تھے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو آئے اور دیکھے کہ عروس شاہجہاں آباد کا دولھا کس طرح مصروف گلگشت ہے۔ اور چمن کی ایک ایک پتی کو اپنے ہاتھ سے درست کر رہا ہے۔ دریائی دیوار پر جس کا منہ کبھی جمنا کی لہریں چومتی تھیں اور آج بھنگڑوں کا تکیہ ہے، لاہوری دروازہ تک متواتر پھیرے کرنے والا اور ایک ایک پودے کی دیکھ بھال کرنے والا کون ہے؟

بساطِ زندگی پر حکومت کے مہرے ہمیشہ اُلٹتے بدلتے رہتے ہیں یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ ہر ترقی مرکب ہے اجزاء انحطاط سے، ہر عروج کی تہ میں زوال پوشیدہ، اور ہر بقا کا انجام فنا ہے۔ قلعۂ معلّٰی کی بسنے والی یہ شاہی ہستی بھی فانی تھی، مگر ہر حیات بعد ممات اپنا اثر چھوڑ رہی ہے۔ آدمی مرتا ہے مگر اُس کے کام زندہ رہتے ہیں۔ حکومت تاراج ہو جاتی ہے مگر طرز حکومت فنا نہیں ہوتا۔ یہ چراغ سحری ٹمٹما کر گل ہو جائے مگر تاریخ کا تیل اس کی بتی اُکسا کر واقعات روشن کرتا ہے اور دُنیا حق رکھتی ہے

کہ اس داستان پارینہ پر مرحبا کے نعرے لگائے یا لعن طعن کی بارش کرے۔ آج قلعہ معلّیٰ کی وہ عالیشان چھتیں جو ابابیلوں کا وطن اور چڑیوں کا ڈیرہ اور کوّوں کا مسکن ہیں اُس وقت دلہن بنی تھیں۔ بادشاہ گلگشت سے فارغ ہوئے اور کونہ کونہ معائنہ کیا۔ آسمان اگر توجہ کرتا تو اس چمنستان میں سینکڑوں پودے ایسے نظر آتے جن کا ہر پھول اور پھول کی ہر پتی تاریخ کا ایک دفتر ہوتی ——— مگر

میرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اُڑ گئے آندھیاں آتے آتے

سات بج چکے ہیں اور جاڑوں کے نہیں گرمیوں کے اور یہ وہ وقت ہے کہ رعیت کے ایک دو نہیں سینکڑوں، ہزاروں آدمی، حلوا پوری، کچوریاں، بوڑیاں، دودھ جلیبیاں، نہاری روٹی، کھا چکے ہیں مگر یاد رکھنا کہ اس وقت تک رعیت کا بادشاہ نہار منہ ہے۔ سب جگہ سے پھرتے پھراتے تسبیح خانہ میں آئے، دو نفل ادا کئے۔ اور کچھ اور پڑھ کر باپ دادا کی پاک روحوں کو ثواب پہنچایا اور ایوان خلوت میں داخل ہوئے۔ مہتمم ادویات نے مجرا کیا۔ اور سربمہر شیشیاں جن پر میاں احسن حکیم کے دستخط ہیں نکالیں۔ جہر توڑی اور یاقوتی کی پیالی تیار کی۔ اصیل خواص نے طلائی طشتری میں چھلکوں سمیت دو تولہ چنے پیش کئے۔ بادشاہ سلامت نے پہلے یاقوتی کی پیالی پی۔ اس کے بعد چنوں سے منہ صاف کیا اور بیگمی پان کی ایک گلوری کھا کر مٹی کے کاغذی حقہ کو منہ لگایا۔ شہر کے مختلف حالات سنائے گئے،

ابھی یہ ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ خبر نویس نے حاضر ہو کر مجرا کیا۔ اور اس لئے کہ نمازِ مغرب کے بعد دن بھر کے حالات سُنا چکا تھا۔ اس وقت صرف رات کی سرگذشت سُنائی۔ دوسرے خبر نویسوں نے تصدیق کی۔ حقہ جل گیا ایک گلوری پان کی اور کھائی اور اُٹھ کر دیوان عام میں تشریف لائے۔

پرستارانِ مغرب! تمہارا خیال سچا اور تمہاری رائے درست! میں معترض نہیں اور اعتراض کروں تو کس منہ سے؟ وقت تمہارا، رنگ تمہارا، دن تمہارا، رات تمہاری، میں پرانا دکھڑا رو کر مخل نہیں ہوتا، مگر ایک نظر اِدھر بھی سہی۔ یہ دیکھئے قلعہ کے دروازہ سے دیوان عام تک پہرے لگے ہوئے ہیں مگر کس ضرورت سے؟ اس لئے نہیں کہ کوئی فریادی پہنچ نہ سکے۔ بلکہ اس لئے کہ ہر فریادی کو بآسانی باریاب ہونے دیں، ہر محکمہ کا ایک افسر دست بستہ حاضر ہے اور گو حکومت کا دائرہ قلعہ کے اندر ہی محدود ہے مگر دیگ کا ایک ہی چاول اور پھول کی ایک ہی پنکھڑی ساری داستان سُنا دے گی۔ ایک فریادی بھنگن روتی پیٹتی سُر منہ چھپائے چلی آرہی ہے! وہ آرہی ہے اور پہرے والے ہاتھوں ہاتھ لا رہے ہیں۔ اس نے دیوان عام میں داخل ہوتے ہی زمین چومی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"جہاں پناہ! مرزا محمود میری
دونوں مرغیاں لے گئے"

مال، دیوانی، فوجداری وغیرہ وغیرہ کے افسر دست بستہ حاضر ہیں۔

اور اپنے اپنے کاغذات لئے خاموش بیٹھے ہیں۔ حکومت اگرچہ محض قلعہ کی چار دیواری تک محدود ہے مگر اس میں بھی سب کچھ موجود ہے۔

بھنگن کی فریاد نے بادشاہ کو مکدر کر دیا۔ اور حاضرین میں سے بھی ہر شخص یہ رنگ دیکھ کر سناٹے میں بیٹھا ہے تمام ضروری کام درہم برہم ہو گئے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اپنا معاملہ پیش کر سکے یا کچھ عرض کرے۔

دو مرغیوں کا معاملہ ہے۔ جو ڈھائی تین آنے سے زیادہ کی بات نہیں۔ سب کی تیوری پر بھنگن کی داویلا سے بل آجاتا ہے۔ مگر دم بخود ہیں کہ بادشاہ سلامت نے آہستہ سے حکم دیا۔

"دومت، جا مرغیاں آتی ہیں"

بھنگن زمین بوس ہوتی ہوئی اُلٹے قدموں گئی۔ مرزا محمود جو ولی عہد کے قریبی عزیز تھے طلب ہوئے اور سرنگوں کھڑے ہو گئے حضور نے فرمایا۔

"اُرے محمود، بھنگن غریب کی مرغیاں! ہا ہا ہا!"

علی احمد داروغہ کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔

"دِلوا دو اور ایک بڑھتی دلواؤ"

مرزا محمود نے زمین چومی اور داروغہ نے ساتھ لیجا کر دونوں مرغیاں بھنگن کی اور ایک بطور جرمانہ تینوں بھنگن کے ہاں پہنچا دیں۔

وہ کمبخت آنکھیں جو اس رنگ میں کھلیں اور کھلی رہیں بند ہونے سے پہلے اور وہ بدنصیب کان جن میں یہ باتیں رسی اور بسی رہیں بیکار ہونے سے قبل جب یہ سماں دیکھتے اور سنتے ہیں کہ مظلوم سر پھوڑ رہا ہے اور ظالم محلہ ہی میں مزے اڑا رہا ہے تو ان پر کیا گذرتی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

آرام کر رنگون کی خاک میں سونے والے تاجدار! سو میٹھی نیند سو، اور ابدی نیند سو، اس وقت تیری مقدس قبر کا غبار بھی جو ہماری آنکھوں کا سرمہ ہوتا ہم کو نصیب نہیں مگر تو، اے رعیت نواز بادشاہ! تو آنکھوں کو وہ شان دکھا گیا کہ جب تک کھلی ہیں تیرا کلمہ پڑھیں گی اور جب بند ہوں گی تو تجھ پر فاتحہ پڑھتی ہوئی۔

توشہ خانہ کی گھڑیال سے دس کی آواز آئی اور افسران محکمہ نے اپنے بستے کھولے، قلم دان سنبھالے اور حکم احکام لے کر کاغذات پر دستخط کرائے۔

ایک گھنٹہ تک یہ ہی سلسلہ رہا اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے یا قوتی اور چینوں کے سوا کوئی چیز پیٹ میں نہیں پہنچی۔ گیارہ گھنٹہ بجتے ہی بادشاہ تخت سے اٹھے، اہلکاروں نے مجرا کیا چوب داروں نے بآواز بلند درازی عمر کے نعرے لگاتے۔ اور جہاں پناہ زنانہ محل میں تشریف لے چلے، دروازہ پر پہنچتے ہی جسولنی جو خاص وردی پہنے ہوئے، عصا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی آگے بڑھی اور زور سے کہا۔

"پیر و مرشد حضور عالی بادشاہ سلامت عمر دراز"

تین دفعہ یہ نعرہ بلند ہوا۔ محل کے تمام متعلقین کو تشریف آوری کی خبر ہو گئی۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ محل میں داخل ہوتے ہی چوبدار صبح کا رخصتی مجرا ان الفاظ میں بجا لائے۔

"ترقی اقبال، درازی عمر"

بہت سی عورتیں جو مختلف عہدوں پر مامور تھیں، اور مختلف ناموں سے پکاری جاتی تھیں ڈیوڑھی میں آکر جمع ہوئیں۔ اِدھر جہاں پناہ داخل ہوئے اُدھر اُنہوں نے عصا سامنے رکھکر دونوں ہاتھ باندھ لئے اور جھک کر کورنش بجا لائیں۔ اب آگے آگے جہاں پناہ پیچھے پیچھے حبشنیاں، کہارنیاں، کشمیرنیاں، حبشنیں، ترکنیں، مورچھل کرتی۔

"ادب ہوشیار، ادب ہوشیار"

کہتی ہوئی چلیں، یہاں تک کہ جہاں پناہ محل میں پہنچے۔ بڑی بیگم صاحب نے کھڑے ہو کر تعظیم دی اور ان کے کھڑے ہوتے ہی امراء و رؤسا کی بیگمیں، شہزادیاں کھڑی ہوئیں۔ جہاں پناہ نے سب کی طرف دیکھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ تخت پر بیٹھے اور سب کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ اِدھر یہ سب اپنی اپنی جگہ تھیں اُدھر زربفت و کمخواب کے ددکسنوں کی مُہردار دوغہ کشمیرن نے جس کا نام مہتاب تھا توڑی۔ بیگم صاحب نے اپنے ہاتھ سے بھنڈہ تیار کیا۔ چاندی کی صراحی سے پانی لیا سونے کی کٹوری میں ڈالا اور لکھنؤ کی سنہری طشتری میں جو چاندی سونے سے پٹی ہوئی

سے ہے اُٹھ کر اپنے ہاتھ سے پیش کیا۔ جہاں پناہ نے بھنڈہ نوش فرمایا۔ جس قدر بیگمیں اور شہزادیاں تھیں دوسرے کمرہ میں جا پہنچیں۔ بیگم نے خود تازہ پان کی گلوری بنائی۔ چاندی کا ورق نیچے اور سونے کا اوپر لگا کر گلوری دی۔ بادشاہ سلامت منہ میں لیکر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہوئے کہ مہتاب سامنے آئی۔ جھک کر مجرا کیا اور عرض کیا۔

"دسترخوان تیار ہو؟"

حکم ہوا "اچھا"

اُسی وقت مہتاب اُلٹے پاؤں لوٹی اور ایک لمبا چوڑا دسترخوان اس طرح بچھایا کہ نیچے چمڑا۔ چمڑے پر سیتل پاٹیاں۔ سیتل پاٹیوں پر وسط میں چار گز طویل آدھ گز بلند تخت اور چاروں طرف دسترخوان، جہاں پناہ آکر تخت پر تشریف فرما ہوتے۔ دائیں طرف بیگمیں، بائیں طرف شہزادیاں، مقابل میں مرد اور لڑکے۔ پہلے سیلابچی بادشاہ سلامت کے روبرو آئی۔ ان کے بعد داھنی طرف سے سلسلہ شروع ہوا۔ تین سیلابچیوں کے دور ہوئے۔ یعنی شاہی سیلابچی سے صرف بیگموں کے ہاتھ دھلے۔ دوسری سے شہزادیوں کے اور تیسری سے مردوں کے، حضور نے کھانوں پر نظر ڈالی تو باعتبار موسم یہ چیزیں ہوئیں۔

پتیلی کے کباب۔ ہرن۔ مرغ۔ تیتر۔ بٹیر۔ مور۔ خرگوش۔ چہے مرغابی۔ سرخاب۔

شامی کباب۔ بکرا۔ مرغ۔ ہرن۔ قاز۔ کلنگ۔ ہریل جنگلی کبوتر مچھلی (روہو، سول، ٹی، مہاشیر)

سالن سادہ۔ مرغ۔ بکرا۔ ہرن۔ کبوتر۔ مچھلی۔ ہریل۔ اور سادہ۔ کچا لوٹے مصالحہ کا، کھڑے مصالحہ کا۔ پسے مصالحہ کا۔

سالن ترکاری دار۔ وراز گھیا۔ ترئی۔ بھنڈی۔ آلو۔ اروی۔ کچالو۔ پنڈالو۔ رتالو۔ کھیرا۔ ککڑی۔ زمین قند۔ پرول۔ شلجم۔ چقندر۔ گوبھی۔ مٹر۔ بیگن۔ کریلے۔ ساگ۔ کچنال۔ سیم کے بیج۔

چاول نمکین۔ بریانی۔ قبولی۔ پلاؤ۔ مرغ پلاؤ۔ ہریل پلاؤ۔ چنا پلاؤ۔ صندلی پلاؤ۔ نرگسی پلاؤ۔ فالسائی پلاؤ۔ شاہی پلاؤ۔ کوفتہ پلاؤ۔ بیضہ پلاؤ۔ شاہجہانی پلاؤ۔ نورجہانی پلاؤ۔ بونٹ پلاؤ۔

چاول میٹھے۔ زردہ۔ متنجن۔ کشمشی متنجن۔ بادامی متنجن۔ آبی متنجن۔ ہریلی متنجن۔ فالسائی متنجن۔ مار اللحمی متنجن۔ اسرائیلی متنجن۔ مزعفر۔

روٹی۔ چپاتیاں سادہ۔ پراٹھے سادے۔ بل دار۔ روے کے۔ میدے کے۔ شیرمال۔ باقرخانی۔ خمیری۔ گاؤدیدہ۔ گاؤزبان۔ نان گلزار۔ نان بہار۔ ہمایونی روٹی۔ روغنی روٹی۔ کلچے۔ بیسنی روٹی۔ مکئی کی روٹی۔ باجرے کی روٹی۔ جو کی روٹی۔ چاول کی روٹی۔ بری روٹی۔ اصفعی روٹی۔ کمل گھی کی روٹی۔ نیلوفری روٹی۔ مصری کی روٹی۔

کھیر۔ فیرینی۔ سادہ کھیر۔ الو کی کھیر۔ بادام کی کھیر۔ پستہ کی کھیر۔ آموں کی کھیر۔ گاجر کی کھیر۔ چنوں کی کھیر۔ رس کی کھیر۔ نقرئی کھیر۔ طلائی کھیر۔

دلبہا اور برائنہ۔ دودھ۔ ٹنڈے، بیگن، درازکھیا۔ ترئی، کریلے۔ گوشتا۔

بورانی۔ سادہ۔ ککڑی۔ مونگا۔ بیسن۔ کھیرا۔ بیگن۔

قیمہ۔ مرچ۔ سادہ۔ ہری مرچ۔ لال مرچ۔ سیاہ مرچ۔ میتھی، سویا، کریلے، خاگینہ، انڈے۔

سموسے۔ آلو، قیمہ، تیتر، بٹیر، مرغ، مچھلی، اروی کے، انڈے کے، زعفرانی، نرگسی، سلیمانی، سادہ۔

ٹکڑے۔ خمیری۔ نان پاؤ۔ گاؤ دیدہ۔ گاؤ زبان۔ میٹھے۔ سلونے۔ آبی۔ ترنجی۔ ہندوستانی۔ ایرانی۔

دالیں۔ بادشاہ پسند۔ سرخابی۔ بحری۔ ترکمانی۔ سادہ۔ بھنی ہوئی۔ تلی ہوئی۔ بھیگی ہوئی۔ خشک ارہر۔ مونگ۔ ماش۔ پنج میل۔ مسور۔ ملکہ مسور۔

کھنڈویاں۔ بیسن۔ دہی کی۔ سادہ۔ قلمی۔ لمبی۔ گول۔ چوکور۔ بھنی ہوئی۔ تلی ہوئی۔

میٹھی چٹنیاں۔ اناناس۔ آم۔ ککرونده۔ پیاز۔ راحت جان۔ پودینہ۔

سلونی چٹنی۔ پودینہ۔ ہری مرچ۔ کیری۔ آم۔ پیاز لحمی۔ عرق نانی۔ سرکہ۔ ادرک۔ سیم کے بیج۔ پسے ہوئے تلے ہوئے۔

مربے۔ آم۔ اناناس۔ ادرک۔ امرود۔ بہی۔ سیب۔ گڑہل۔ بڑہل۔ کٹھل۔ گاجر۔ مولی۔

حلوے ۔ گاجر۔ رواموولی۔ چنا۔ موتی چور۔ مونگ۔ نورجہانی۔ اکبری فرخی۔ آسمانی۔ زعفرانی۔ فلک نما۔ غزنوی۔ ایرانی۔ سورانی۔ عربی۔ تاشقندی۔ مصری۔

مٹھائیاں ۔ حلواسوہن۔ گلاب جامن۔ قلاقند۔ موتی پاک۔ کھجور۔ امرتی۔ لڈو۔ پیڑے۔ بالوشاہی۔ اندرسے۔ اندرسے کی گولیاں۔ پیٹھے کی مٹھائی۔ پھینیاں۔ ربڑی۔ بالائی۔

پھل ۔ آم۔ خربوزہ۔ کیلے احمد آبادی۔ بنگالی۔ کولی۔ رنگترے۔ شریفے۔ لیچیاں۔

پانچ برتنوں میں کھلی۔ بیسن۔ اٹبنہ۔ صابن۔ آٹا رکھا ہوا ہے۔ پچاس رومال ہاتھ صاف کرنے کے واسطے موجود ہیں۔ جہاں پناہ نے سب طرف ایک نظر ڈالی اور سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ شمیم خواص نے گلاب پاش کھولا۔ پہلے چاروں طرف گلاب چھڑکا گیا۔ اس کے بعد کیوڑہ اور اس کے بعد عطر خس۔ جہاں پناہ نے سب سے پہلے فیرینی میں چمچہ ڈالا۔

اب وہ منظر آتا ہے جو بڈھا ظفر اپنے ساتھ ختم کر گیا اور جو جوہر ہمیشہ ہمیشہ چمکے گا۔ آج یہ غریب، قلاش و مفلس کنگلے جن کو دہلی نے نکال کر باہر پھینک دیا، جمنا کے کنارے بھوکے مر رہے ہیں۔ یہ اُس وقت قلعہ میں موجود ہوتے تھے۔ سات من روٹیاں خمیری اور پانچ دیگ سالن ان کے واسطے تیار ہوتا تھا۔ اِدھر جہاں پناہ نے فیرینی میں چمچہ ڈالا۔ اُدھر چوبدار نے چیخ کر آواز دی۔

"طعام مبارک"

اب کیا تھا کنگلے کھانے پر ٹوٹ پڑے اور پیٹ بھر دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے۔ اللہ اللہ کیا سماں تھا اور کیا لوگ تھے۔ بادشاہ کو اُس وقت تک کھانا حرام تھا، جب تک بھوکی خلقت پیٹ نہ بھر لے۔ پرواز تخیل سفر کرتا ہے۔ بازو شل ہو جاتے ہیں۔ جب دماغ یہ منظر سامنے لے آتا ہے۔ کیسے دل ہوں گے اور کیسے دِن، جب دُنیا ان ہستیوں سے معمور اور اس زمانہ سے دوچار تھی۔ ایک دو نہیں بیسیوں اللہ کے بندے غریب غربا ایسے تھے جن کا پیٹ فقط شاہی دسترخوان سے پلتا تھا۔ یتیموں کی روٹی الگ تھی۔ رانڈوں کا لنگر جُدا تھا۔ یہ ایسا سماں قلعہ معلیٰ کی آنکھیں دیکھ چکی ہیں کہ اب مر کر بھی نظر نہ آئے گا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو حقیقت اور واقفیت سے جدا ہو کر تماشہ اور سوانگ کے لباس میں جلوہ گر ہیں۔ حیرت اور اچنبھا ہوتا ہے کہ آناً فاناً کیسا اِنقلاب ہو گیا، ایک قلعہ معلیٰ کیا تمام شاہجہاں آباد وہ دن یاد کریگا اور روئے گا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وقت نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ وہ سماں رہا نہ زمین، اور مکان رہا نہ مکین۔ دیکھئے اِس محبت کو دیکھئے۔ چار پانچ لقمہ کھانے کے بعد شاہی نظریں اِدھر اُدھر پہنچیں۔ سلیمان شکوہ کے چھوٹے بچے کو پاس بلایا اور اپنے ہاتھ سے اُس کے مُنہ میں نوالہ دیا۔ اور اب یہ سِلسلہ شروع ہوا تو آخر تک منقطع نہیں ہوا۔

ایک لقمہ اپنے منہ میں ایک دوسرے کے۔ لینے والے شکریہ کے واسطے زمین تک جُھک جُھک پڑتے ہیں، مگر انعام شاہی ختم نہیں ہوتا۔

وہ گراں قدر صورتیں جن کا مقولہ یہ تھا کہ کھانے سے زیادہ کھلانے، اور پہننے سے زیادہ پہنانے میں لطف ہے، یہ تسلیم کہ مٹ چکیں، مگر اُن کی رائے کارزار حیات میں آبِ زر سے لکھی ہوئی ہے۔ اور یہ وہ رائے ہے جس کی قیمت زمانہ کی رفتار کے ساتھ بڑھے گی اور جب دُنیا کا عجائب خانہ ان داستانوں کو بھی فنا کر دے گا۔ اس وقت اگر کبھی بھولے بسرے یہ صدا کسی کان میں آجائے گی تو سننے والے سر دُھنیں گے۔ حیرت کا ہاتھ اِن باتوں کو سونے میں تولے گا۔ اور قلب مضطرب حقیقت کے پروں سے فضائے تخیل میں شاہجہاں آباد سے اُڑ کر رنگون پہنچے گا۔ سینہ پر گھونسے مارے گا اور خاک ظفر پر قربان ہو گا۔

ذرا یہ سیر بھی دیکھنا، جہاں پناہ طعام تناول فرما چکے۔ مگر ابھی ہاتھ نہیں کھینچا، صرف اِس لئے کہ کھانے والے بھوکے نہ رہ جائیں۔ کھا بھی رہے ہیں، کھلا بھی۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سب کھا چکے تو ہاتھ اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا، شاہی ہاتھ اُٹھتے ہی تمام ہاتھ بارگاہ حقیقی میں اُٹھ گئے۔ ایک خواص سیلابچی، دوسری آفتابہ، تیسری بیسن، چوتھی کھلی۔ پانچویں اُبٹنہ لئے حاضر ہوئی۔ اِدھر جہاں پناہ اُدھر باقی سب ہاتھ دھو کُلّی کر فارغ ہوئے۔ خواص خاص نے بادشاہ کے روبرو سونے کا خلال پیش کیا۔ دوسروں نے نیم کے تنکے لئے۔ بڑی بیگم صاحبہ نے

پٹاری سنبھالی اور اپنے ہاتھ سے گلوری تیار کی۔ جہاں پناہ گلوری منہ میں رکھے ہوئے بارہ دری میں تشریف لائے اور پہرے والیاں اپنی اپنی جگہ کھڑی ہو گئیں۔ فراشی پنکھے چلنے شروع ہوئے اور جہاں پناہ قیلولہ میں پہنچے۔

دوپہر کی توپ چلی اور بارہ دری کے چاروں طرف پہرے لگ گئے۔ اب مجال نہیں کہ چڑیا کا بچہ بھی بارہ دری میں داخل ہو سکے۔ امیر، غریب، نوکر چاکر سب خاموش اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں کہ جسولنی جو بارہ دری کے خاص کمرہ میں پہرہ دے رہی تھی دوڑی ہوئی آئی اور کہا "آبدار خانہ کے داروغہ سے کہو آبحیات جلد حاضر کرے۔" داروغہ تیار تھا اُسی وقت ایک صراحی گنگا کے اور ایک جمنا کے پانی کی جو چار پہر تک نتھار کر سر بہ مہر برف میں دبائی تھی لے کر آگے بڑھا۔ ایک صراحی میں رکھی۔ دوسری جسولنی کو دی۔ جسولنی نے خواص خاص کو دی اس نے جا کر ملکہ عالیہ کے سامنے مُہر توڑی اور طلائی کٹورے میں اُن کے سامنے پانی اُلٹا ملکہ دوراں اپنے ہاتھ سے پانی پلانے چلیں اور کٹورا پیش کیا۔ بادشاہ نے پانی پیا اور "الحمد للہ" کہہ کر بستر پر استراحت فرمائی۔

خسخانے ہر چہار طرف لگے ہوئے ہیں۔ چھڑکاؤ ہو رہا ہے پنکھے جھلے جا رہے ہیں اور ایک عالم سُنسان ہے جہاں سانس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

اس دنیوی جنت میں جہاں خس اور جوانسے سے لپٹ کر لُو کے تھپیڑے بھی برف کے تودے بنجاتے تھے۔ جہاں ہر طرف سے موتیا اور چنبیلی کی لپٹیں چلی آتی تھیں، دو گھنٹے تک یہی کیفیت طاری رہی اور دو بجے اِدھر ظہر کی اذان ہوئی اُدھر نوبتی نے ظہر کا نقارہ بجایا۔ جہاں پناہ بیدار ہوئے۔ پہرہ اُٹھ گیا۔ صرف ایک برقنداز۔ وہ بھی عورت ہشیار رہی۔ انناس کے خمیرہ کا تماکو حقہ میں بھرا گیا۔ دو چار گھونٹ لے کر جہاں پناہ کھڑے ہوئے۔ جسولنی نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "کرامات پانی تیار ہے" وضو خانہ کی طرف تشریف لے گئے۔ وضو کیا۔ کیکر کی مسواک کی۔ باہر تشریف لائے۔ نماز پڑھی۔ محل کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے آکر مجرا کیا۔ جہاں پناہ نے آبِ حیات طلب کیا۔ صراحی کی مُہر توڑی گئی۔ بادشاہ سلامت نے پانی نوش فرمایا۔ بچوں نے

"حیات مزید"

کے نعرے لگائے۔ خواصوں نے آمین کہی۔

اب ایک نقرئی صندوقچہ لاکر رکھا گیا۔ چاروں طرف اگر کی بتیاں روشن ہوئیں۔ لوبان سُلگایا گیا اور جب تمام کمرہ خوشبو سے مہک گیا تو خود اپنے دست مُبارک سے جہاں پناہ نے وہ صندوقچہ کھولا اور ایک طلائی صندوقچی نکال کر بوسہ دیا۔ اس کو کھول کر شاہانِ مغلیہ یعنی باپ دادا کی نشانیاں نکالیں۔ بابر کی انگوٹھی۔ ہمایوں کا

کنگھا۔ اکبر کا رومال، جہاں گیر کے سر کے بال۔ شاہ جہاں کی حمائل۔ اورنگ زیب کا قلم۔ اِن سب کو بوسہ دیا۔ اور ایک چھوٹی سی کتاب ہیں جو طلائی کام سے جگمگا رہی تھی اور زربفت و کمخواب کے جزدان ہیں رکھی ہوئی تھی تمام تاجدارانِ سلطنت کے دستخطوں کو آنکھوں سے لگایا۔ فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچایا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور اپنے سامنے دست مبارک سے سب کو بند کر مقفل کیا۔ اگردان، عطردان، لوبان ہٹا دئے گئے۔ عصر کی اذان ہوئی۔ نقارچی نے چار دھونسے بجائے۔ اِدہر بادشاہ سلامت نے نماز پڑھی، سلام پھیرا، دُعا مانگی، کھڑے ہوتے توجبولنی سے سامنے آکر مجرا کیا اور ہاتھ باندھ ادب سے عرض کیا۔

"عملہ محلہ یوزک رکاب سب حاضر"

بادشاہ سلامت برآمد ہوئے، چوبدار نقرئی عصا لئے ساتھ ہیں خواجہ سرا دست بستہ آگے آگے چل رہے ہیں۔ نقیب ہر قدم پر آواز لگا رہا ہے۔

"مزید اقبال مزید اقبال"

جھروکوں میں تشریف لائے۔

ہائے "جھروکوں" کا نام آتے ہی کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا! یہ چیزیں کیا ہوئیں؟ اور وہ دن کدھر گئے۔ مگر نہیں سب کچھ ہے۔ جو جب تھا وہ اب ہے، قلعہ بھی ہے، جھروکے بھی ہیں، دِن بھی ہیں راتیں بھی ہیں،

فقط ایک چیز چلی گئی! اخلوص، خلوص،
انسان وہی ہیں دِل وہی ہیں مگر کچھ ایسی کایا پلٹی کہ صداقت دلوں سے رخصت ہوئی۔ محبت کی جگہ نفرت نے لی۔ ایثار کے بدلے خود غرضی موجود ہوئی اور سچائی نے مکر و دغا کا جامہ پہنا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دِل کی اُمنگوں پر اُوس پڑ گئی۔ اور وہ حوصلے بالکل ہی مٹ گئے۔ زندگی کے بکھیڑے اِس بُری طرح ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ جو ہے وہ گرفتار آلام اور مصیبت کا شکار۔ مگر کتابِ حیات کے یہ اوراق پریشان حق رکھتے ہیں کہ چشم بینا ان خاک کے تودوں پر دو آنسو گرائے۔ پیاروں اُٹھو، کھڑے ہو، خیالستان کی سرزمین پر ایک جنازہ میں شریک ہو، جھروکوں میں بیٹھو، اور سامنے کے منظر پر

نظر ڈالو۔

جمنا خشک! سبزہ اُجاڑ لہلہاتے ہوئے پودے، ڈہڑہاتے ہوئے پھول، چہچہاتا ہوا لالہ، سب خاک کے ڈھیر ہیں!!! کہتا ہوں اور پھر کہتا ہوں، ہاتھ اُٹھاؤ اور فاتحہ پڑھو اُن پاک روحوں پر جنہوں نے اِس جنگل کو منگل اور اِس اُجاڑ کو گلزار بنا دیا تھا۔ یہاں اِس وقت گیدڑ اور لومڑیاں ہیں! اُس وقت بلبل اور طوطیاں تھیں!

دِن ختم کے قریب آیا، عصر کی نماز ہو چکی، آفتاب کی کرنیں پھیکی پڑنی شروع ہوئیں۔ اور جب دھوپ نے ہر سمت واویلا مچا رکھی تھی وہ قلعہ کی زمین سے اُڑ کر برجیوں پر جا دھمکی۔ کِس کو خبر تھی کہ دو دن دشمن

کی یہ شام جس کو آج قلعہ معلّے اس شان سے وداع کر رہا ہے ایک روز اس کی شام غریباں ہو گی اور یہ کنگرے جن کے پتھر بسم اللہ کی چھاؤں میں رکھے گئے۔ جن کا سایہ اس وقت تیموری شہزادیوں کے قدم چوم رہا ہے ایسے اُجڑیں گے کہ قلعہ کی ہر سمت، سمت کا ہر پتھر اور پتھر کا ہر جوڑ داستان عبرت ہو گا۔ قصر تیموری کی وہ فضا جس میں ہوادار ظفر اُڑ رہا ہے، اس میں اُلو اور ابابیلیں کھیلیں گی اور جس خندق میں آبِ زلال کے چشمے بہ رہے ہیں، یہ کیچڑ کو ترسے گی اور جہاں صبح شام رنگ برنگ کے پھول مہکتے ہیں یہاں دن رات خاک اُڑے گی۔

یہ "بسم اللہ" "بسم اللہ" کی صدائیں کیسی بلند ہو ئیں؟ نقیب، چوبدار کیوں آراستہ ہوئے؟ یہ نوبت کاہے کی ہے؟ ذرا سامنے دیکھنا سُرخ سبز پگڑیاں، زردا چکنیں، گول پنجہ کی جوتیاں، اکّا دکّا نہیں، قطار در قطار لیجیے، وہ سب ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور یہ متفقہ صدا جس سے قلعہ گونج گیا سُنائی دی۔

"قدم ہوشیار نگاہ روبرو"

اچھا جہاں پناہ تشریف لائے اردبیگنیاں سُرخ سبز کپڑے پہنے مردانہ لباس میں کندھے پر ہوادار لئے کھڑی ہیں۔ ہوادار تو صرف آٹھ ہی کے کندھوں پر ہوتا ہے مگران کے ساتھ کندھا بدلنے کو ایک پورا غول کا غول موجود ہے۔ اچھا جہاں پناہ ہوادار میں تشریف لائے۔

کیکری کٹاؤ کا گاؤ تکیہ۔ مقیش گوکھرو کے پردے، زربفت، کمخواب کے گل تکیے۔ ہوادار میں قدم رکھتے ہی داروغہ نے عرض کیا۔

"کرامات پردہ باندھ دیا جائے؟"

حکم ہوا "ہوں"۔ جھلا جھلی کے پردے اُٹھے خواجہ سراؤں نے مورچھل سنبھالے۔ حبشیوں کا دستہ نان جہان کے ساتھ ساتھ ہے افغانیوں نے جریب لئے اور آگے بڑھے "قدم ہوشیار نگاہ روبرو" کے نعرے لگ رہے ہیں۔ لوگ جشنِ تخت نشینی، جشن شاہی، جشن یہ جشن وہ کے منتظر رہتے ہیں۔ شوق سے دیکھتے اور ذوق سے شریک ہوتے ہیں ظفر کا جشن روزانہ جشن تھا، اس کا ہر روز عید اور ہر رات شبرات تھی۔ مگر یہ خالی خولی جشن نہ تھے، یہ وہ جشن تھے جو رعیت کو مالا مال کر دیتے تھے۔ اوّل تو خلقت یوں ہی چونچال اور خوشحال نظر آتی تھی اور کسی بدنصیب پر کوئی بپتا آبھی پڑی تو بُڈھا ظفر اپنے ہاتھ سے اُس کے زخم پر مرہم رکھتا تھا۔ وہ لوگوں کی شادیوں میں برابر کا شریک، مصائب میں دلی غمگسار، دن کو اُن کا بادشاہ، رات کو اُن کا یار تھا۔ کچھ اور بھی دیکھا یہ ہوادار کے آگے کیا ہو رہا ہے؟ تعجب نہ کیجئے۔ بھوکی خلقت اپنا پیٹ بھر رہی ہے۔ ننگے اپنا بدن ڈھانک رہے ہیں۔ دیکھئے چاندی کے پھول نچھاور ہو رہے ہیں۔ اور خیرات خانہ کا منیب بھر بھر مٹھیاں ہوادار پر لُٹا رہا ہے۔ یہ چاندی آج کی چاندی نہ تھی کہ ایک روپیہ کا آٹا رومال کی پوٹلی میں لے آؤ، سستا سماں، اچھے لوگ، پاک نیتیں، صاف دِل، تین تین ماشہ کا

ایک پھول' ایک کبھی ہاتھ لگ گیا تو تین دن کو بے فکر ہو گئے۔ ظفر کی سواری خاصا اچھا میلا تھی کہ قلعہ کے لاہوری دروازہ سے جامع مسجد تک بھیڑ لگ جاتی تھی۔ سبحان اللہ' سبحان اللہ! یہ منظر عجیب ہے' دیکھئے ایک بڈھا لکڑی ٹیکتا ہوا' کپکپاتے ہاتھوں سے سامنے آیا اور جھک کر مجرا کیا' ہوادار سے آواز آئی "ہوں" اب اردبیگنیاں آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں۔ وہیں تھم ہو گئیں۔ بڈھا قریب پہنچا۔ بادشاہ نے کانا پھوسی کی' اور دُعائیں دیتا زمین چومتا سیدھا ہو لیا۔

کیونکر روئیں اور کس طرح روئیں کس کس بات کو اور کون کون سی ادا کو' ظفر بہت سی خوبیوں کا ایک مجموعہ تھا جس کی زندگی دلّی والوں کو تاجدارانِ مغلیہ کی جھلک دکھا گئی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے دورِ اولین کا سیّاح جب ہمایوں اور صفدر جنگ کے مقبرول اور خانخاناں کی تربت سے فاتحہ پڑھ کر روتا ہوا لوٹتا تھا تو قلعہ معلٰے کی زندہ ہستی کے کارنامے اُس کے آنسو پونچھ دیتے تھے۔ دل مجروح ترقیٔ اقبال کی دعائیں دیتا تھا' اور شاہی چہل پہل مٹے ہوئے نقشے آنکھوں سے دکھا دیتی تھی!

بڈھا ہشاش بشاش ہنستا مسکراتا دل ہی دل میں باتیں کرتا مگن چلا جا رہا ہے' تان جہان آگے بڑھا۔ سامنے کے چوبداروں نے آواز دی "خبردار" چاروں طرف سے جواب ملا " اللہ رسول خبردار" برابر کی جسولنیاں بآواز بلند کہہ رہی ہیں "اقبال افزوں" اور اُس کے

ساتھ ہی "اقبال افزوں" کا نعرہ ہوا میں گونجتا ہے۔ لیجیئے حقّہ کا حکم ہوا حقّہ بردار بغل میں گنگا جمنی کلی، چاندی کی چلم، سونے کا چنبل، اکبرآبادی پیچوان لئے حاضر ہے۔ حکم پاتے ہی حقّہ تیار کیا اور اللہ رسول کی امان کہہ کر شاک کی مثال تان جہاں میں پہنچادی۔ خمیرہ تمباکو سے بازار مہک اٹھا۔ ضرورت کی تمام چیزیں جو لبیوں اور چوبداروں کے ساتھ ہیں۔ کسی کے پاس اگالدان، کسی کے پاس بینی پاک دست رومال۔ ایک کے پاس برف میں دبی ہوئی دو صراحیاں موجود ہیں۔ دوسرے کے پاس بھنڈہ تیار ہے۔ گھڑیالی سوا آدھا، پونا، پورا بجاتا جاتا ہے۔ توشہ خانہ کی مہتمم جسولنی زربفت کے کپڑے میں بیگمی پانوں کی گلوریاں لئے حاضر ہے۔ تان جہان کے چاروں طرف آٹھ جگادری حبشی بلّم ہاتھ میں لئے چل رہے ہیں۔ دفعتہً جامع مسجد سے مغرب کی اذان کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ "اللہ اکبر" کے ختم سے پہلے کہاروں نے جس جگہ تھے وہیں تان جہان رکھ دیا اور سب دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں پناہ اذان کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئے۔ کفش بردار نے فوراً زیرپائی سامنے رکھی جہاں پناہ نے جوتی پہنی اور مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ قلعہ معلیٰ کے کنگرے اور جامع مسجد کی برجیاں یہ تماشہ دیکھ چکی ہیں، آگے آگے دولہا، پیچھے پیچھے برات۔ مغرب کی نماز کو جا رہے ہیں۔ مسجد میں داخلہ ہوا۔ یہاں تعظیم و ادب سب معاف ہیں۔ اور سوا سلام علیک کے کسی دوسرے لفظ کی اجازت نہیں۔ جہاں پناہ نے خود ہی فرمایا: "سلام علیک" حوض پر تشریف لائے گلی کی خواص نے

دست پاک دیا، ہاتھ پونچھے، بینی پاک دیا منہ پونچھا، اور نمازیوں کے ساتھ صف میں آشامل ہوئے، نماز ختم ہوئی۔ سلام پھیرا۔ دعا مانگی گئی۔ جہاں پناہ اٹھ کھڑے ہوئے تو "اللہ اکبر" کی متفقہ صدا سے مسجد گونج اٹھی۔ قلعہ کی سڑک اب روشنی سے جگمگا رہی ہے، سونے چاندی کے عصا اور برتن بھانڈے چمک رہے ہیں۔ بادشاہ تامجھان میں بیٹھے۔ پیش خواص نے آواز دی۔

"اقبال زیادہ! بڑھو آگے بڑھو"

سواری لوٹی۔ تخت رواں کے پردے اٹھا دیے گئے۔ سواروں نے گھوڑے نیزے کیے اور تامجھان سے پہلے قلعہ میں پہنچکر سواری کی اطلاع دی۔ حبشی رسالہ استقبال کو دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ عشا سے قبل سواری واپس آئی۔ دو گھڑی رات تک جہاں پناہ شاہجہانی باغ میں ٹہلتے رہے، عشا کی نماز موتی مسجد میں پڑھی اور محل میں تشریف لے گئے۔

دوسری نوبت

روزِ عید

اٹھائیسویں روزے کو سحری کے بعد بیس سانڈنی سوار جنکی سانڈنیاں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کوس کا دھاوا مار یں، چاروں طرف روانہ ہو گئے اور آٹھ آٹھ نو نو منزل جا کر پڑاؤ کیا۔ یہ انتیسواں روزہ ہے جو چاند کی خبر سب سے پہلے لائے گا اس کو شرعی شہادت کے اطمینان پر پانچ اشرفیاں اور ایک جوڑہ انعام ملیگا۔ سانڈنی سوار جنگل میں شہر والے کوٹھوں پر، عورتیں ممٹیوں پر، غرض لاکھوں آنکھیں آسمان پر گڑی ہوئی ہیں۔ مغرب کے وقت خود جہاں پناہ دیوان عام کی چھت پر تشریف لائے۔ آج افطاری کا سامان یہیں ہے۔ کورے کورے مٹکے، سوندھی سوندھی صراحیاں، کاغذی آبخورے قطار در قطار چنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف برف میں گھڑے دبے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بڑے بڑے ہنڈوں میں جست کی قلفیاں اور آبخورے بالائی اور دودھ کی برف سے بھرے ہوئے ہیں۔ فالسہ، خربوزہ، پستہ، بادام، غرض ہر قسم کی برف موجود ہے۔ دوسری طرف دُنیا بھر کی مٹھائیاں۔ کچوریاں، سموسے، دالیں، سیم کے بیج، قلمی بڑے، پھلکیاں، دہی بڑے وغیرہ وغیرہ۔

مگر آج افطار کا بھوکا کوئی نہیں، جو ہے وہ چاند کا عاشق، نماز کے بعد خود جہاں پناہ چاند دیکھنے اٹھے، اللہ بسم اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں، خاصہ میں پانچ اشرفیاں ایک بیڑہ دو تھان گلبدن کے، ایک تھان الگ زربفت کا حاضر ہے کہ جو سب سے پہلے چاند دیکھے اُس کا انعام۔

خدا خدا کر کے چاند نظر آیا، یہ جوان عید ہے، مجرے شروع ہوئے جو سامنے آیا جھک کر سلام کیا۔ لاہوری دروازہ سے گیارہ توپیں داغی گئیں۔ نوبت خانہ سے نقارہ کی آواز بلند ہوئی۔ جامع مسجد کے حوض پر پچیس گولے چھوٹے، شہر کو عید کی خبر ہو گئی اور رعیت عید کی تیاریوں میں مصروف ہوئی۔

شاہی عید کو چند لمحہ کے واسطے قلعہ معلّٰی میں چھوڑ کر شہر میں آیئے اور دیکھئے۔ آج سے پچاس سال قبل کے مسلمانوں میں عید کس طرح منائی جاتی تھی، عید کی خوشیاں منجھلے روزہ ہی سے شروع ہو جاتی تھیں، اپنی اپنی حیثیت کے موافق امیر غریب، سب تیاریاں کرتے تھے، گھر میں سفیدی ہوتی تھی، کمرے انگنائیاں، دالان، دریچے، دُھلتے تھے، کپڑے سِلتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں آتی تھیں سوئیاں ٹوٹتی تھیں۔ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی گھٹی میں یہ سبق پڑا تھا کہ عید مسلمانوں میں خوشی وہ روز ہے جس کی برابری دوسرا دن نہیں کر سکتا۔ زنانہ سنگار کی یہ ہوائی چوڑیاں جو دو ٹوٹ کر دو چڑھیں

اس وقت نہ تھیں۔ ہاں لاکھ اور کانچ کے جوڑے تھے۔ منہیاریاں
خود تیار کرتی تھیں، اور اپنے اپنے ٹھکانوں میں پہنا کر مالا مال ہوتی تھیں۔
کوئی ایسا ہی منحوس گھر ہوتا ہوگا۔ جہاں اس رات کو جس کی صبح عید ہوتی
تھی مسرت بھری آوازیں نہ بلند ہوتی ہوں۔ بچوں کی خوشی ناقابل بیان ہے،
شاموں شام جو تیاں آئی ہیں، بغل میں لئے اُچھل رہے ہیں۔ اس
خوشی کا کیا ٹھکانا کہ رات کو سرہانے رکھکر سوئے، لڑکیاں اپنے گوٹہ
کناری کے کپڑے دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہو رہی ہیں۔ بھوک پیاس سب
اُڑ گئی۔ ماکھانے کا تقاضہ کر رہی ہے اور بچی مہندی کا، بڑی مشکل سے
دو چار نوالے جوں توں کھائے اور مہندی کی رکابی لے آئی۔ سرِ شام کے
سونے والے بچے کہیں خدا خدا کر کے گیارہ بجے بچھونوں پر لیٹے اور
سوئے تو بچوں کی ماں اور میاں کی بیوی نے صبح کی اہم ضرورتوں کا
ٹھیک ٹھاک کیا۔ پہلے بچوں کے کپڑے درست کئے پھر میاں کے
کام کاج پر نظر ڈالی۔ اس سے فرصت ہوئی تو سوئیاں، چھوہارے،
کھانڈ، نکال کر رکھے۔ گھڑی دو گھڑی پلک جھپکالی تو جھپکالی، ورنہ
اِدھر اذان ہوئی، اُدھر سوِیوں کا پانی چڑھا۔ اِدھر نماز فجر ختم ہوئی،
اُدھر سوِئیاں تیار ہوئیں۔ گھر کی جھاڑو بُہارو دی۔ فرش فروش کیا۔
میاں اور بچے عید گاہ گئے تو آپ کپڑے بدلے۔ اور وہ جو ساری رات
ماماؤں کی طرح ایک ٹانگ سے پھری، اس وقت کپڑے اور زیور پہن
پہنا بیگم بن کر بیٹھ گئی۔ مرد اور بچے عید گاہ سے لوٹے تو مٹھائی اور کھجوریں

کھلونے اور ترکاریاں لے کر۔ اب عیدیاں شروع ہوئیں، کسی کو پانچ کسی کو ایک کسی کو اٹھنّی، چونّی، دوانّی، غرض دن بھر یہی سلسلہ جاری رہا۔ شام کے وقت بڑے بھائی چھوٹی بہنوں کے ہاں۔ باپ اپنی بیٹیوں کے ہاں عیدی دینے آئے۔

آنسوؤں کی لگاتار جھڑیاں شروع ہو جاتی ہیں، جب وہ سماں یاد آتا ہے۔ عیدیں اب بھی آتی ہیں اور آئندہ بھی آئیں گی۔ مگر دِلّی کی آنکھیں جو عیدیں نصف صدی پیشتر دیکھ چکیں وہ اب نظر نہ آئیں گی۔ دِل خون ہو کر بہنا اور آنکھیں زندگی کو سلام کرتی ہوئی ختم ہو جاتی ہیں۔ جب وہ رنگ رلیاں عالم خیال میں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ شاہ جہاں آباد آج کا شاہ جہاں آباد نہ تھا۔ اس کے بسنے والی صورتیں جن کو صیّادِ اجل نے تاک تاک کر اجاڑا وہ پکھیرو تھے جو اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ گئے۔ وقت نے اُن کے ساتھ ان کے نشیمن بھی تاراج و برباد کر دیے۔ کارخانۂ حیات اس سے زیادہ عبرتناک منظر اور کیا دکھائے گا کہ آنکھ بند تھی تو گلاب کے خوشنما پودے پر طائر خوش الحان جھوم جھوم کر نواسنجیاں کر رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو وہ طائر تھے نہ گلاب۔ صبا ہے نہ چمنستان۔ کالی رات اور ہُو کا میدان۔

وہی دور جہالت کا رونا ہے۔ مگر کیا کروں ان ہی باتوں میں پیدا ہوا، اور ان ہی باتوں میں پرورش پائی۔ مجھے تو ان ہی باتوں میں مزا آتا ہے۔ لیجیے یہ تماشہ دیکھیے۔

منہیاری آئی، کون منہیاری؟ ٹکے کی چوڑیاں پہنانے والی، مگر کس طرح آئی؟ گھر میں داخل ہوتے ہی بہوؤں نے جھک کر آداب کیا۔ بیٹیوں نے سلام کیے۔ منہیاری نے دعائیں دیں۔ اور گھر والی کے پاس پہنچی۔ بہوؤں اور بیٹیوں نے منہیاری کو کھڑے ہوکر آداب وسلام کیا تھا۔ گھر والی نے بیٹھے ہی بیٹھے مگر گردن جھکا کر۔ منہیاری نے سر پہ ہاتھ رکھا۔ دعا دی اور بیٹھ گئی۔

ما کا اشارہ پاتے ہی بیٹی یا بہو نے سویّاں، کچوریاں، مٹھائی سامنے لاکر رکھی۔ منہیاری نے پیٹ بھر کر کھائی۔ کلّی کی، پانی پیا، بیوی نے پٹاری کھول زردہ بنایا۔ منہیاری نے پان منہ میں رکھا اور یہ دعا دی۔

"بوڑھ سہاگن۔ سائیں جیے۔ بچے جئیں"

چوڑیاں سارے گھر کی آٹھ دس آنے سے زیادہ کی نہ ہونگی۔ بیوی نے ڈھائی روپے بٹوے سے نکال سامنے رکھے اور کہا "لو بوا اپنا نیگ" منہیاری سکڑ کر پیچھے ہٹی اور کہنے لگی "واہ بیگم یہ ڈھائی کیسے؟ میں تو وہی پانچ لوں گی، اور اب کے تو اور زیادہ دو۔ تمہاری حسنا بھی تو سسرال سے آئی ہوئی ہے۔ اُس کی عیدی بھی لوں گی" بیگم نے اٹھنّی اور دی "لو حسنا کی بھی لو" منہیاری اب بھی اکڑ رہی ہے اور ہاتھ نہیں لگاتی "نہیں بیوی میں تو پورے پانچ لوں گی۔ اللہ رکھے سب خرچ پورے ہوتے، میرے ہی دو روپے کاٹ رہی ہو۔ میں تو بڑی بیگم صاحب

سے پانچ ہی لیکر اٹھتی تھی۔" بہو بیٹیاں دم بخود ہیں۔ لڑکے خاموش ہیں۔ اور اگر صاحب خانہ موجود ہیں تو ان کی بھی مجال نہیں کہ بزرگوں کے زمانہ کی منہیاری کے سامنے اُف کرسکیں۔ بیگم نے ایک روپیہ اور دیا کہا "بس دیکھ لو چار روپے ہوگئے، یہ ہی لیجاؤ۔ اللہ چاہے تو بقر عید پر کسر نکال دوں گی۔" بہتیرا ہی بیوی نے سمجھایا مگر منہیاری نے نا سے ہاں نہ کی اور یہی کہے گئی "اے بیوی سال کا میلہ ہے، تمہاری جوتیوں کی طفیل بال بچوں کی عید ہو جاتی ہے۔ تم دینے والے زندہ رہو کہ مجھ بڑھیا کا مان رکھ لیتی ہو۔" بیگم نے ایک روپیہ اور دیا۔ منہیاری دعائیں دیتی ہوئی اٹھی۔ لڑکی نے سلام کیا تو یہ دعا دی۔ "جیتی رہو نصیبہ اچھا ہو۔ اماں باوا کی سلامتی میں اپنے گھر سدھارو۔" بہو نے سلام کیا تو یہ دعا دی۔

"بوڑھ سہاگن دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو"

میر انیس مرحوم علی اکبرؓ کے مرثیہ میں اس وقت جب سید الشہداء نے جوان بیٹے کی لاش اٹھائی فرماتے ہیں۔

"دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے"

میں آج صاحب جہل کہاں سے لاؤں جو دورِ جہالت کے ان آبدار موتیوں کی داد دیں۔ ہر سمت ترقی کا بازار گرم ہے اور جدھر نظر ڈالتا ہوں تعلیم یافتہ ہی تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں، جو ان واقعات کو حماقت اور جہالت ہی تصور کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے چمنستانِ معاشرت میں یہ اخوت کے ایسے سدا بہار پھول تھے کہ گو باغ و چمن سب فنا

ہو چکے نگران پھولوں کی مہک ابھی باقی ہے اور یہ اتنی تیز ایسی سنگین اس قدر استوار ہے کہ زمانہ کی رفتار اس کو لاکھ خاک میں ملا دے، یہ مٹ کر زندہ ہوگی اور جن زبانوں سے اِس وقت جہالت کے نعرے بلند ہو رہے ہیں اُن کی گردنیں جھکیں گی۔ آنکھیں کھُلیں گی اور کہنا پڑے گا کہ اُٹھنے والی روحیں اِسلام کا سچا نمونہ تھیں اور اُن کا نقش قدم حق رکھتا تھا کہ آنے والی نسلیں سر آنکھوں پر رکھیں۔

اپنے جگر کے آبلے پھوڑ کر دوسروں کی تضیع اوقات اور اپنے زخم کے کیڑے دکھا کر اوروں کو پریشان کیوں کیا۔ اِس داستان کو ختم کیجیے اور یہ کتھا چھوڑیئے۔ چلیے اُدھر ہی چلیئے وہی قلعہ معلّٰی ہے اور وہی شاہجہان آباد کا وہ چاند ہو گیا، انعام و اکرام تقسیم ہوئے، محل میں تمام رات چہل پہل رہی، چاند کی سلامی اکیس توپیں خبر آتے ہی داغی جا چکی ہیں۔ مودی خانہ، توشہ خانہ، توز خانے کے داروغہ اپنے اپنے سامان کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔ محل میں بہو بیٹیاں بزرگوں کو چاند کا آداب عرض کر رہی ہیں۔ اور دُعا پا رہی ہیں۔ چھ گھڑی رات کی توپ چلی۔ تنبو اور ڈیروں کی گاڑیاں عیدگاہ روانہ ہوئیں۔ شامیانے تنے، تنبو لگے، ڈیرے پڑے، خیمے کھڑے ہوئے، فوجدار خاں فیل خانے کے داروغہ جو اصل نسل سیّد تھے اور جن کے سوا بادشاہ کی طرف کوئی پیٹھ نہ کر سکتا تھا تشریف لائے، اور ماتحتوں کو حکم دیا "ہاتھی رنگدو"، مولا بخش ہاتھی رنگا گیا، شاہی خلعت تیار ہوا، لڑکی بالیاں چوڑی مہندی میں مصروف ہیں۔ بارہ بجے بادشاہ آرام گاہ

میں تشریف لے گئے۔ چار بجے عید کی توپ چلی، جہاں پناہ بیدار ہوئے، حمام فرمایا، خلعت فاخرہ زیب تن کیا، اور نماز فجر موتی مسجد میں ادا کی۔ جواہر خانہ میں تشریف لائے، سر پر تاج رکھا۔ گلے میں ہار ڈالا، خاصہ بردار خواجہ سراؤں نے دسترخوان بچھایا، سب سے پہلے حضور نے ایک چمچہ سیویوں کا اور ایک ٹکڑا چھوہارے کا تناول فرما کر افطار کیا۔ اس کے بعد ایک نوالہ خشک اور مسور کی دال۔ کلی کی، پان کھایا اور کھڑے ہوئے۔ اردبیگنیوں نے "اللہ رسول کی امان" پکاری۔ نفیریوں نے نفیری بجائی اور سواری کا حکم ہوا۔ حضور باہر تشریف لائے، دورویہ فوجوں نے سلامی دی۔ فوجدار خاں نے ہاتھی لگایا، حبشیوں نے ہوادار پیش کیا، جہاں پناہ ہوادار میں تشریف لائے، باجہ شروع ہوا، فوج کا ایک دستہ آگے بڑھا، ایک جلو میں رہا اور ہوادار دیوان عام میں پہنچا۔ اہل کاروں نے مجرا کیا، سرکار ہاتھی پر سوار ہوئے، اکیس توپیں سلامی کی چھوٹیں، تلواروں کی چھاؤں اور باجہ کی آواز میں جہاں پناہ قلعہ کے دروازہ پر تشریف لائے۔ مغلئی فوج نے مجرا کیا۔ ہاتھی پر حضور، پالکی میں ولی عہد، گھوڑوں پر امرا، بیچ میں سواری، اِدھر اُدھر فوج، اب شاہی جلوس عیدگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور حکم عام پکارا گیا۔

حکم عام کا خیال دل میں پیدا ہوتے ہی بجلی کی طرح دماغ میں گدگداتا ہوا ہاتھ میں پہونچا۔ قلم سے یہ دونوں لفظ نکلتے ہی وہ سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ اور وحشت زدہ طبیعت پھر رنگ لائی۔ حکم عام کیا ہے؟

اِذنِ عام سُنا ہوگا۔

وہ جنازے پر مِرے کِس وقت آئے دیکھنا
جبکہ اِذنِ عام میرے اقربا کہنے لگے

اب تو اذنِ عام کیا میت کو شرفا کندھا بھی نہیں دیتے۔ مگر معاشرت اسلامی میں اذنِ عام بے معنی نہیں ہے۔ میت کی نماز سے فراغت پانے کے بعد ورثا میت بآوازِ بلند کہتے تھے۔

"اذنِ عام"

یعنی جس کا جی چاہے رہے جس کا جی چاہے چلا جائے۔ اگر کسی کو کام ہو تو اجازت ہے شوق سے جائے۔

اذنِ عام کا دوسرا بھائی حکمِ عام تھا اور وہ اس طرح کہ فضائے مسرت میں بادشاہ اپنی معصوم اور بھولی چڑیوں کو یاد کرتا تھا جو شاہین و باز کے مظالم کا شکار ہوتی ہوں۔ یعنی قلعہ معلّٰی سے برآمد ہوتے ہی جب ملکہ مسرت کی خانہ زاد چیریاں فرحت و شادمانی کے تاج شاہی پر چیور کرتی تھیں تو عالمِ تخیل میں سب سے پہلی چیز جو بادشاہ کے سامنے آتی تھی وہ مخلوق کی اذیت ہوتی تھی۔ قربان اس شفقت و کرم کے اپنی راحت دوسروں کی مصیبت پر قربان تھی۔ وہ کیا دل تھا جس کی رائے یہ تھی کہ احباب میں ایک فرد بھی غمگین ہے تو میری خوشی کِرکِری۔ اسی واسطے حکمِ عام تھا کہ ہر فریادی، ہر مظلوم، ہر شاکی، ہر مغموم آئے اور اپنی بپتا سُنائے۔ اسی کا نام حکمِ عام تھا۔ لاہوری دروازہ تک چاندی کے پھول غربا و فقرا کے

واسطے پچھاور ہوتے تھے۔ مگر اب چونکہ راستہ تنگ اور میدان ایک تھا خیرات بند ہوجاتی تھی۔ باجہ اور نقارہ ختم ہوجاتا تھا اور صناعان مشرق کے نمونے شروع ہوتے تھے۔ یہ کہنے کو تو بچوں کے کھلونے ہوتے تھے۔ مگر ایسے کھلونے کہ بڑوں کی عقلیں بھی حیران تھیں۔ موجودہ ایجادیں جن کا سہرا مغرب کے سر ہے اور آج کا مشرق جن پر سر دھن رہا ہے اٹھارھویں صدی کے مشرق سے پوچھو اور اُس کا جائزہ لو یہ سب تماشے نظر آجائیں گے۔ وقت ان کی قدر کرتا اور رفتار زمانہ انکو پامال نہ کرتی تو دیکھنے والے دیکھتے کہ جس مشرقی گود کو آج بھیک کے ٹکڑے مانگنے سے فرصت نہیں ملتی اُس کا دامن ایسی ایجادوں سے مالامال ہے۔ جن کا جواب مشکل سے ملے گا۔

یہ کھلونے روپیوں اور آنوں کے نہیں پیسوں کے ہوتے تھے۔ مگر ایسے کہ ان پر اشرفیاں قربان ہوں۔

بجلی کی تونبی۔ تونبی بدفی کی قسم کی ایک چھوٹی سی مٹی کی چیز ہوتی تھی۔ جو اوپر ڈھکنے سے بند اور اندر کوئلہ اور گندک وغیرہ آگ پر رکھنے سے اس میں دھواں پیدا ہوتا تھا اور دھوئیں میں دیا سلائی یا چراغ کی بتی لگا دینے سے بجلی کی روشنی ہوتی تھی جو ایک پیسہ میں خاصی آدھ گھنٹہ تک رہتی تھی روشنی ظاہر ہے کہ بجلی کے برابر تھی۔

غبارہ اب بھی دیکھنے میں آجاتا ہے اور شائد چھ یا آٹھ آنے کو ملتا ہے۔ اُس وقت یہ پنکھا کہلاتا تھا اور ایک پیسہ کو آتا تھا اور گزوں اُوپر اڑتا تھا۔

کل کا گھوڑا - یہ بھی ایک پیسہ کو آتا تھا۔ کوکنے سے بارہ تیرہ گز آگے بڑھتا تھا۔

تیتری - ٹین کی ہوتی تھی اور ایسی ہلکی پھلکی کہ مشکل سے ایک تیتری چار ماشہ کی ہوتی ہوگی۔ اُس کے سیدھے بازو میں ایک سوراخ ہوتا تھا اور اس سوراخ میں پتلا سا کانٹا، جس کو دبانے سے تیتری ہوا میں اُڑتی تھی۔

کشتی - یہ بھی ٹین کی ہوتی تھی، جس کے پشت پر آدمی ہوتا تھا۔ اور پانی میں مطلق نہ ڈوبتی تھی۔

اس قسم کی سینکڑوں چیزیں ہوتی تھیں جو کم از کم اتنا ضرور بتاتی تھیں کہ ان بدبختوں کو بھی قدرت نے انسانی دماغ سے محروم نہیں کیا۔ یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ اس سے پہلے مشرق نے کیا کر دکھایا۔ مگر یہ سوچنا مشکل ہے کہ مغرب بھی ایک دن میں مغرب نہ بنا تھا۔ یہ وقت کی بات ہے کہ جب مشرقی جواہرات کے جگمگانے کا وقت آیا تو وہ دھونتال پانی پڑا کہ کان ہی کیچڑ بن گئی۔ مگر ھند وستان کی عمارتوں کو لیجئے۔ دلّی کے گوٹہ کناری کو لیجئے، لکھنؤ کی چکن کو لیجئے، اگر ان ہاتھوں میں موتی بھرے جاتے تو یہ وہ ہاتھ تھے کہ آسمان صنعت پر یکتائی کے تارے توڑتے۔ مگر جب ان ہاتھوں کی محنت پیٹ پالنے پر موقوف ہوئی اور بچوں کی پرورش کا انحصار اس ریاضت پر ہوا تو نتیجہ ظاہر تھا کہ یہ کمال اہل کمال کے ساتھ پیوندِ زمین ہوتے۔ کھلونے اب بھی عید بقر عید کو عیدگاہ کے پاس بکتے ہیں

مگر یہ درحقیقت اُن مسافروں کا نقشِ قدم ہیں۔ کھلونے وہ تھے کہ نقل پر اصل کا شبہ ہوتا تھا۔ چکوترے، امرود، کیلے، ہوتے تو مٹی کے تھے مگر کیا مجال جو ذرہ بھر فرق ہو۔ اس گئے گذرے زمانہ میں کہ اناج ڈیڑھ من سے چھ سیر کا ہو گیا اُجڑے دیار کے ایک کمہار نے اپنی مٹی کی تصویر (سٹیچو) خود بنایا۔ اس وقت کی تو مجھے خبر نہیں، مگر آج سے آٹھ دس سال قبل بڑیوں کے کٹرہ میں سر بازار کوٹھے پر رکھا ہوا تھا، اور برسوں رکھا رہا، دیکھنے والے حیرت سے دیکھتے تھے اور اُس کے کمال کی داد دیتے تھے۔ کمہار مرا تو فاقے ہی کرتا ہوا مگر وہ خود دکھا گیا اور اس کی صنعت بتا گئی کہ مشرق بھی اگر پیٹ کے دھندوں سے آزاد ہوتا تو اس بدبخت کا دماغ بھی زندہ رہنے کا حق رکھتا تھا۔

عیدگاہ کے قریب پہنچتے ہی شاہی فیل رُکا اور جہاں پناہ نیچے اُتر کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یہ کس لئے؟ صرف اِس لئے کہ بچے اور عورتیں اپنے بادشاہ کے دیدار سے محروم نہ رہیں۔ اور اگر کوئی مصیبت کا مارا آج بھی دل کا کنول نہ کھلا سکا۔ اور زخم محتاجِ مرہم ہے تو آئے اور جو کچھ عرض کرنا ہے کرے۔

لیجئے جہاں پناہ عیدگاہ میں داخل ہوئے، خیمہ شاہی کھڑا ہے، مگر حضور والا معمولی مسلمانوں میں تشریف فرما ہیں۔ تکبیر شروع ہوئی، نیت باندھی، دوگانہ پڑھا، سلام پھیرا، لوگوں کی آواز نے خاتمہ نماز کا اعلان کیا۔ اب خطبہ کا وقت آیا۔ حکم شاہی ہوتے ہی داروغہ توشہ خانہ

آگے بڑھا۔ کشتی میں ہفت پارچہ خلعت اور مرصع پرتلہ امام صاحب کے سامنے پیش کیا۔ بنارسی دوپٹہ کمر سے باندھا۔ تلوار کمر میں لگائی۔ امام صاحب نے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر خطبہ پڑھا۔ بادشاہ کا نام آتے ہی حاضرین نے آمین کے نعرے بلند کیے۔ خطبہ ختم ہوا۔ پچاس روپے نقد امام صاحب کو عطا ہوئے اور جہاں پناہ ہوادار میں سوار ہو کر قلعہ معلّٰی میں تشریف لائے۔

تختِ طاؤس کی منتظر آنکھوں نے جس کی ہڈیاں اب بھی موجود ہیں، شاہی قدموں کو بوسہ دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یورپین رزیڈنٹ آگے بڑھ کر زمین بوس ہوا۔ نذر پیش کی حضور نے نذر کو ہاتھ لگا کر قبولیت عطا فرمائی۔ اب دوسری نذریں پیش ہوئیں۔ انعام تقسیم ہوئے، ادھر بارہ بجے کی توپ چلی ادھر حضور محل میں تشریف لائے۔ اور یہاں زنانہ نذریں سامنے آئیں۔ کھانا تناول فرمانے کا وقت آیا۔ نقارہ پر چوٹ پڑی۔ دیگوں کا لنگر لٹا۔ عید کا کھانا تقسیم ہوا، بھوکی رعیت نے پیٹ بھرا، لوگ چلنے شروع ہوئے تو حضور دسترخوان پر تشریف لائے۔ بڑی بوڑھیوں نے دعائیں دیں۔ بچوں نے مجرا کیا، عیدیاں عطا ہوئیں، اور جہاں پناہ کھانے سے فراغت پا کر آرام گاہ میں تشریف لے گئے۔

آج عید کی رات ہے لال قلعہ چوتھی کی دلہن بنا جمنا کی گود میں کھڑا ہے۔

چپہ چپہ اور کونہ کونہ پر قندیلیں جگمگا رہی ہیں۔ درختوں پر ڈال ڈال اور پات پات قمقمے لٹک رہے ہیں۔ موتی مسجد کے کنگرے موتیوں کی چمک اور ابرک کی دمک سے رات کو دن بنا رہے ہیں۔ شہزادہ شہزادیوں کے زربفت و کمخواب کے لباس چاروں طرف جھلملا رہے ہیں۔ گانے کی آوازیں بلند ہیں۔ ستار باز اور بین نواز اپنے اپنے کمال دکھا رہے ہیں۔ طبلے کھڑک رہے ہیں، ڈھول بج رہے ہیں۔ کہیں قوالی ہے، کہیں ناچ، غرض ہر سمت ہو ہو ہا ہا کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ جو ہے وہ خوش اور جس کو دیکھو مگن۔ کیا مجال کہ کوئی چہرہ مضمحل اور صورت پریشان نظر آ جائے۔ باجے، گاجے، ناچ رنگ، غل غپاڑہ۔ غرض قلعہ کی زمین نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔

میرے مرحوم دوست شہزادہ مرزا محمد اشرف صاحب گورگانی بی۔ اے۔ کہتے تھے کہ مرزا گوہر نے عید کی ایک رات کا واقعہ ایسا بیان کیا کہ اب بھی خیال آ جاتا ہے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں دِلّی کی رونق بہت کچھ لُٹ چکی تھی۔ گدھے کے ہل پھرے تو نہ تھے لیکن گدھے لوٹنے شروع ہو گئے تھے۔ بہار گو ختم نہ ہوئی تھی مگر خزاں کے آثار ہر چہار طرف نمایاں تھے۔ فارغ البالی اور اطمینان ابھی فنا نہ ہوئے تھے مگر افلاس اور بے چینی کی مردہ صورتیں آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ دلوں کے چھالے پھوٹے نہ تھے۔ لیکن زخموں کا پیام لا چکے تھے۔ بادشاہ کا دم ایک کرم تھا، جو ہر خراش پر مرہم کا

کام کر رہا تھا۔ اُس کی تسکین کا ایک ہاتھ سخت سی سخت تکلیف اور اسکے بیار کی دو باتیں بڑی سی بڑی اذیت کو رفع کر دیتی تھیں۔ اِس آخری دور میں بھی کہ بہادر شاہ شطرنج کا بادشاہ رہ گیا تھا۔ مملکت کرم میں رحم کے ایسے دریا بہا گیا ہے کہ چشم بینا دیکھ کر سر دُھنتی ہے۔

مشہور شہسوار مرزا محمود کا شباب ضعیفی سے بدل چکا تھا اور انحطاط کے ساتھ ہی افلاس نے اپنے ڈیرے ڈال دئے تھے۔ مرزا کی جوانی کا رنگ دیکھنے والوں کو مرزا میں خدا کی شان نظر آتی تھی۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں شربتی کا اکہرا انگرکھا، کمر پٹیا بندھا ہوا، رنگ سرخ سفید، کھڑی مونچھیں، چڑھی ڈاڑھی، تنے ہوئے ڈنڑ، گٹھا ہوا بدن، رستہ چلتوں کی نظر پڑتی تھی۔ نماز فجر کے بعد اکھاڑے میں گھسے۔ ڈنڑ، بیٹھکیاں، مگدر، لڑنت، کثرت، ڈھائی تین گھنٹے تک محنت کی، بدن پسینہ پسینہ ہو گیا۔ کڑھاؤ میں دس سیر دودھ چڑھا ہوا ہے۔ اونٹتے اونٹتے مسا کر کے سیر تین پاؤ رہ گیا۔ یہ پی پلا کر گھر آئے تو منہ سلونا کرنے کو سیر بھر گوشت کی روکھی بوٹیاں چکھیں۔ ابھی کھانے کا ذکر نہیں ہے۔ کپڑے بدلے۔ سرکار کے مجرے کو چلے تو اِس شان سے کہ اک برا پاجامہ، دودھ کلا انگرکھا، لیس دار ٹوپی، جدھر نکل گئے انگلیاں اُٹھ گئیں۔ خوش پوشاک، خوش خوراک، بدن سے خون ٹپکتا تھا۔ چکن اور شربتی تو در کنار کبھی بھولے بسرے نین سکھ کا کُرتہ گلے میں ڈال لیا تو چھوٹا پڑتا تھا۔ یہ وہ دور ہے جب مرزا چقندر بنے ہوئے تھے۔ ایک دو دفعہ نہیں بارہا سیر ڈیڑھ سیر گھی

کی پتیلی منہ سے لگا کر ختم کر دی۔ سننے والے تعجب نہ کریں یہ ذکر اُس وقت کا ہے جب دودھ پیسہ سیر اور گھی پانچ سیر کا تھا۔ مجرے سے فارغ ہو کر گھر آتے تو کھانا تیار رہتا۔ بُھنا ہوا ڈھائی سیر گوشت، سیر بھر گھی کے چار پراٹھے چُورم چُور سامنے آتے۔ اس طرح صاف نگلتے کہ بھورا تک نہ بچا۔ کھا چکے تو پلنگ پر لیٹے۔ توے کا حُقّہ بھرا ہوا ہے مگر کیسا تو یہ سلفچیا تو انہیں کہ دو گھونٹوں میں بھڑک گیا۔ وہ توا جس کے نیچے پاؤ سیر دورسے کی ٹکیا جمی ہوئی ہے۔ دھیمی دھیمی اُپلے کی آنچ میں دم کھا رہا ہے۔ سُلگا تو تین گھنٹے کی خبر لایا۔ حقہ وہ کہ دو بجے بھرا تو چار بجے تک چلا اور چلم وہ جو دس کو چھکا دے۔

یہی مرزا محمود جس کا سینہ چھاج کی طرح پھیلا اور قد کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔ جس کی جوانی ہاتھی کے آگے خم ٹھونکتی تھی۔ بڑھاپے کے ایک ہی شکنجے میں ایسا دھنسا کہ گردن زمین سے دو انگل اونچی رہ گئی۔

وہ بوٹا سا قدِ رعنا کہ عالم جس پہ مفتوں تھا

خمیدہ ہوتے ہوتے رہ گیا پشتِ دوتا باقی

مرے کو مارے شاہ مدار۔ ایک اکیلے مرزا کے مقابلہ میں مصائبِ حیات کا پورا انبار تھا۔ نہ معلوم کس منحوس گھڑی کا بڑھاپا آیا کہ ہر طرف سے آفات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ جو چہرہ پھول کی طرح ہر وقت کھلا رہتا تھا اب اس پہ بھول کر بھی ہنسی نہ آتی تھی۔ اور آ سکتی بھی نہ تھی۔ ہر رات اپنے ساتھ نئی پریشانیوں کے اسباب اور ہر آفتاب اپنی رکاب میں غیر متوقع افکار کے

سامان لا رہا تھا دو جوان لڑکوں کے جنازے ڈھوئے، ایک بچوں والی لڑکی بیوہ نذر زمین کی اور پچیس روپے ماہوار کی آمدنی گھٹتے گھٹتے نو روپے رہ گئی۔ یہاں تک بھی خیر لشتم پشتم گذر ے گئی۔ مگر بچوں والی ماں نے جو پچاس برس کی رفیق تھی جنگل بسا ھا نڈ کی کمر توڑ دی اور اُس کی یادگار مرگی کا دورہ باقی رہ گیا۔ جو پہلی مرتبہ قبرستان میں اُس وقت اُٹھا جب ممچیاتی لاش آنکھ کے سامنے اور بھری چار پائی پیشِ نظر تھی اور آخری مرتبہ بسترِ موت پر اس وقت جب خون جاری اور سکرات طاری تھی۔

مرزا کی تمام عمر کا اثاثہ ایک لڑکی فرخ سلطانہ اور ایک بنگالی مینا تھی۔ فرخ داروغہ توشہ خانہ کے داماد مرزا احمد کے لڑکے سے بیاہی گئی جب تک وقت نے میرزا کا ساتھ دیا اور بات بنی رہی سمدھیوں میں خوب میل جول رہا۔ لیکن جب پاسہ پلٹا اور بگڑی تو ہمسا ذا میں دنیا بھر کے کھڑے ہوگئے۔ اِدھر ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہا اُدھر بینائی میں فرق آیا۔ رات کو تو گھر سے باہر نکل ہی نہ سکتے تھے۔ دِن کو بھی مرگی کی وجہ سے کہ خبر نہیں کس وقت کس حال میں اور کہاں دورہ اُٹھ آئے۔ اشد ضرورت کے سوا کہیں آتے جاتے نہ تھے۔ البتہ اُجڑے دیار کے مالک کی محبت ایک ایسی چیز تھی جو مرزا کو کسی نہ کسی طرح گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ کھینچ لاتی تھی اور وہ بھی زیادہ تر اس لئے کہ اگر مرزا نے ناغہ کی تو گھڑی آدھ گھڑی راہ دیکھ کر حضور خود

تشریف لے آتے۔ مرزا کا عروج دیکھنے والے دس بیس نہیں تمام قلعہ اور آنکھوں والے تھے۔ اُن کے ویرانہ حیات کا ہر ذرّہ درسِ عبرت تھا۔ مصائب مرزا میں وقت کا وہ ستم جس نے بیچارے کی رہی سہی ہمّت توڑ دی غربت و افلاس تھا اور وہ اس طرح کہ فرخ کی شادی کے وقت پانسو روپیہ پانچ روپیہ ماہوار کی قِسط پر ساہوکار سے قرض لئے۔ جو تنخواہ کے پھول پھلی کو گن والیتا۔ بادشاہ کو خبر نہ تھی کہ نو کے چار رہ گئے۔ مرزا ایک ایک پیسہ کو محتاج ہیں۔ فاقہ بھی کئی دفعہ ہوا۔ مگر مرنے والوں کی آن اور اگلے لوگوں کی وضعداری تھی کہ سب کچھ انگیز گئے اور منہ سے بھاپ نہ نکالی۔

جب مرزا کا بھرا پُرا گھر اِس طرح صاف ہوا کہ بات کرنے کو آدمی تک نہ رہا۔ اور جہاں کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی وہاں سنّاٹا ہو گیا تو مرزا کی حالت اور بھی قابلِ رحم تھی۔ سو سال کے قریب اِس دُنیا میں اِس شان سے زندگی بسر کی کہ ہر وقت دس پانچ آدمی جلو میں حاضر رہتے' آج مرتے وقت اس کے پاس کوئی اتنا نہ تھا کہ چراغ جلا کر دُنیا سے رخصت کر دیتا۔ عمر بھر کا اثاثہ دو جاندار تھے اور وہ بھی اِس طرح کہ ایک لڑکی سُلطانہ پرائے گھر کی اور ایک مینا' وہ جانور' مرزا احمد کبھی مہربان ہوئے بہو کو دو چار روز کے واسطے بھیجدیا' ورنہ مرزا تھے اور یہ عالیشان حویلی۔ اب مرزا کے کٹھن دن اور مصیبت بھری راتیں اِس طرح گذرتیں کہ وہ ہوتے اور تنگا لن ہوتی۔

باقی آدمی نہ آدم زاد۔ اس وقت مرزا کی تمام محبّت دُنیا سے سمٹ سمٹا ان مٹھی بھر پروں پر محدود تھی۔

آج زمانہ کی رفتار وہ معصوم سسرتیں فنا کر چکی، جن پر فرشتے مرحبا کہتے تھے۔ مگر دِلّی میں غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے بعد بھی کچھ روز تک یہ دستور قائم رہا کہ ساون میں لڑکیاں جھولا جھولنے میکے آتی تھیں۔ اِس رسم کی یادگار اب بھی برسات میں یہ گیت سُننے میں آتا ہے۔

"گڑاری ہنڈولا ہے بابل گھر"

مرزا احمد کسی رسم بادستور کے پابند نہ تھے اور رہتے کیونکر واسطہ ایک ایسے شخص سے پڑا تھا جس کی شخصیت بھی نیست ہو چکی تھی مرزا محمود شکایت کے قابل نہ گلہ کے لائق۔ مگر نہ معلوم کیا سوچ کر احمد نے اپنی بہو فرخ سلطانہ کو چار روز کے واسطے میکے بھیج دیا۔ سنتی مسجد کے مشرقی سمت میں پیپل کا گنجان درخت تھا۔ جھولا پڑا اور لڑکی بالیاں جمع ہوئیں۔ رات کے فرّاٹے میں فرخ کی بھنبیری آواز نفیری کی طرح گونج رہی تھی۔ مرزا محمود گو اب کسی قابل نہ رہے تھے مگر احساس موجود تھا بچّی کی خوشی اُن کا جذبہ مسرّت دوبالا کر رہی تھی کہ پیپل کے درخت نے دغا دی اور جانہار فرخ کا سر ایک پتھر پر جا کر پڑا۔ جوں توں اُٹھا کر گھر لائے۔ صبح ہوتے جب مرزا اکیلے رہ گئے تو لڑکی کی حالت ردّی ہو گئی۔

کیسا نازک وقت ہے جن آنکھوں کو زندگی کے ہر شائبہ میں مصیبت کا ہولناک دیو نظر آرہا ہے۔ جس دل پر دُنیا کی ہر خوشی حرام مطلق ہوچکی جو ہاتھ کلیجہ کے ٹکڑوں کو پیوند زمین کر چکے ابھی دُنیا کا یہ سلوک اُن سے باقی ہے کہ آنکھیں جوان لڑکی کو دم توڑتے دیکھیں۔ دل خون آلودہ سر کو تڑپ تڑپ کر بوسہ دے اور ہاتھ پیاری فرخ کی نزع میں شربت کی بوندیں ٹپکائیں۔

جس درد نے ابراہیم جیسے اِنسان کی آنکھوں پر پٹی بندھوا دی اور یعقوب جیسے بشر کو دیوانہ کیا وہ مرزا کے ساتھ جو کچھ کرتا کم تھا۔ صبح کی نورانی صورت نے مرزا کی آنکھوں میں دُنیا تیرہ و تار کر دی۔ جب بدنصیب باپ کی اندھی آنکھوں نے بچی کے چہرہ پر آثار موت دیکھے تو دل مجروح تڑپ اُٹھا۔ بلبلا کر ہاتھ گلے میں ڈال دئے تو مرزا کی مہمان بچی نے آنکھیں کھولیں۔ سفید ڈاڑھی کو بوسہ دے کر آنسو پونچھے اور آہستہ کہا۔

"باوا جان صبر"

وہ مرزا جس نے دشمن کا ڈیڑھ اُنگل چاقو کھایا اور اُف نہ کی، اِس وقت دیوانہ وار چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ اُس کے کانوں نے "باوا جان" کی آہستہ آواز سُنی۔ بیٹی کے ہونٹوں پر جُھکا تو حلق خشک اور بند زبان میں کانٹے تھے۔ بچی نے زبان دکھائی تو مرزا کلیجے پر گھونسے مارتا ہوا اُٹھا۔ شہد میسر نہ تھا۔ چمچہ سے چند قطرے پانی کے ڈالے

اور رو کر کہا

"بیٹی جو کام تیرے کرنے کا تھا وہ مجھ سے لے رہی ہے"

افسوس ہے اس کے بعد کے حالات مجھے مطلق یاد نہیں اور میں نہیں کہہ سکتا فاخرؔ کتنی دیر بعد مری کیونکر مری، اور کس کے سامنے مری۔ مگر یہ خوب یاد ہے کہ تیسرے یا چوتھے روز عید تھی۔ صبح کے وقت قلعہ کی مخلوق عید کی بہاروں میں مصروف تھی اور مرزا اپنی بچی کے فراق میں دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے۔ جب دل کی حالت زیادہ بگڑی تو ارادہ کیا کہ قبرستان جا کر ڈھیر سے لپٹوں اور کلیجہ ٹھنڈا کروں۔ دفعتہً نگاہ مینا کے پنجرے پر پڑی۔ اُٹھے، دانہ پانی ڈالا، پیار کیا، چمکارا، آنکھ سے آنسو جاری تھے کہ بدنصیب سمدھی کے گھر میں مرزا احمد یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔

"محمود عجیب آدمی ہو، مرنے کو بیٹھے ہو مگر دنیا کی ہوس نہیں گئی۔ بہو جو زیور پہن کر آئی تھی اُس میں چمپا کلی بھی تو تھی"۔

محمود۔"صاحب عالم مجھے تو خبر بھی نہیں۔ عورتوں ہی نے اُتارا اُنہوں نے ہی بھیجا، مجھے اتنا بے ایمان نہ سمجھو"

احمد۔"بے ایمان تو تم پرلے درجہ کے ہو۔ لاؤ چمپا کلی دو"۔

محمود۔"بھلا صاحب عالم کے فرمانے کی باتیں ہیں۔ میں نے تو آنکھ سے بھی نہیں دیکھی۔ اتنی زیادتی نہ کرو۔ میں پہلے ہی بدنصیب ہوں۔ مجھے ستا کر کیا لوگے"۔

احمد۔ محمود زیادہ باتیں نہ کر چمپا کلی رکھ والونگا۔ چھوڑوں گا نہیں، یہ باتیں کسی اور سے بنا۔"

محمود۔" میاں گھر تمہارے سامنے پڑا ہے دیکھ لو۔"

احمد۔" میاں کے بچے چمپا کلی رکھ دے۔"

محمود۔" صاحب عالم خدا گواہ ہے مجھے خبر نہیں۔"

احمد۔ خدا کی قسم محمود چمپا کلی تجھ سے لوں تیرے باپ سے لوں۔"

احمد کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں۔ اس نے سامنے مینا کا پنجرا دیکھا۔ اتار کھڑکی کھول مینا باہر نکال دونوں ٹانگیں پکڑیں اور کہا:۔

"چمپا کلی دے نہیں ٹانگیں چیر کر پھینکتا ہوں"

بدنصیب محمود ہاتھ جوڑ کر اٹھا اور کہنے لگا۔

"صدقہ خدا کا رحم کر"

احمد کی آتشِ غضب بھڑک رہی تھی کہا "چمپا کلی؟"

محمود نے قدموں میں گر کر کہا۔" کلمہ محمدؐ کی قسم مجھے خبر نہیں۔"

احمد کو یقین نہ آیا۔ ٹانگیں چیرنے لگا تو محمود نے کہا:۔

"سو برس کی زندگی کا اثاثہ یہ ایک جانور ہے اس کی موت نہ دکھا۔"

مگر احمد آپے سے باہر تھا۔ ٹانگیں چیریں تو ادہر مینا کی پہلی آواز بلند ہوئی اور ادہر محمود چیخ مارتا ہوا یہ کہہ کر گرا:۔

"ارے ظالم غضب کیا"

محمود کی مرگی کا یہ دورہ پیامِ موت تھا۔ مردہ مینا اور بیہوش محمود

دونوں برابر پڑے تھے کہ احمد کے لڑکے نے آکر کہا: "چمپا کلی گھر میں موجود ہے۔"

مرزا محمود اس صدمہ سے جانبر نہ ہوئے۔ بادشاہ کو خبر پہونچی دانتوں میں انگلیاں دے لیں۔

وہی عید کی رات ہے اور رنگ رلیاں من رہی ہیں۔ آدھی رات کے بعد مشاعرہ کی مجلس جمی۔ شعراء اپنے اپنے کمال کی داد لے رہے ہیں۔ غالب اور ذوق دونوں اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکے۔ بادشاہ آج خاموش تھے۔ دفعتہً گردن اٹھائی۔ استاد ذوق کی طرف دیکھا اور فرمایا۔
"میاں محمود کی موت نے اس غزل کا مقطع کہلوا دیا" ؎

ظفر آدمی اسکو نہ جانئے گا، وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تیسری نوبت

سلونو

اِس وقت کہ فضائے تعصب میں سلاطین مغلیہ کے مظالم کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے اور رہنمایانِ وطن کے قلم میدانِ تاریخ میں اُلٹی چھری بن کر واقعات کو ذبح کر رہے ہیں۔ آسمان جس نے تاجدارانِ تیموریہ کے کرم اپنی آنکھوں سے دیکھے منافرت کے ان شعلوں پر نظر ڈال کر مسکراتا ہے۔ ملکۂ محبّت جو سرزمین ہند کی سیجوں پر سدا سکھ نیند سوئی آج خار دار چادر پر تڑپ تڑپ کر کروٹیں بدل رہی ہے۔ اُجڑے شہر کے پھٹے پُرانے چیتھڑوں میں بھی شہر آبادی تک خلوص و وضعداری کے گوہر آبدار جگمگاتے ہیں۔ اب ان لوگوں کے تذکرے اور داستانیں اگلے وقتوں کی باتیں کہانیاں ہیں۔ مگر دلِ درد آشنا بلبلا اُٹھے گا کہ جب دیکھے گا کہ ان انسانی ہستیوں کا سکّہ بازاروں میں نہیں گھروں میں چل رہا تھا اور ان کی بھولی بھالی آوازوں نے اِس طرح دل مسخر کر لئے تھے کہ کیا اپنے اور کیا غیر ہر زبان پر اُن کا کلمہ تھا۔ اچھے لوگ تھے کہ اچھّا وقت ملا اور اچھی گذار گئے۔ جب بھی اچھے تھے اور اب بھی اچھے ہیں۔

نیتوں کی برکت اور دلوں کی صفائی تھی کہ دلوں کی جنگجو سلطنتیں بغیر لڑے بھڑے فتح کیں اور اپنا کلمہ پڑھوا گئے۔

سلونو ہندوؤں کا تہوار ہے مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہیں مگر ذرا بھادر شاہ کا دربار اور سلونو کا جشن دیکھئے کہ دونوں قومیں اس تہوار میں برابر کی شریک ہیں۔ پہلے اس کی حقیقت پر نظر ڈالیے۔ اور پھر ان لوگوں کی فراخ حوصلگی اور وضعداری و انصاف کی داد دیجئے۔

شاہ عالم کا باپ عزیز الدین عالمگیر ثانی اپنے سیدھے سادھے معاملات اور بھولی بھالی باتوں کی وجہ سے دورِ آخر میں ایک خاص وقعت رکھتا ہے۔ اِس کا نمک حرام وزیر غازی الدین خاں جس کی دِلی خواہش یہ تھی کہ بادشاہ کو اپنی مٹھی میں رکھے اور جس قدر انعام و اکرام میں صرف ہو اپنی ذات پر ختم کر دے۔ دربار کا یہ رنگ دیکھ کر کہ ہر چھوٹا بڑا اپنے مقصد میں کامیاب ہے انگاروں پر لوٹنے لگا اور اس فکر میں ہوا کہ کِسی طرح بادشاہ کو قتل کر کے اپنے بھتیجے کو تخت پر بٹھا دے اِس منصوبہ کی تکمیل میں اُس نے بعض امراکین کو شامِل کیا اور ایک روز جب بادشاہ عصر کی نماز سے فارغ ہوئے تو عرض کیا "جہاں پناہ ایک فقیر روشن ضمیر کوٹلہ میں تشریف فرما ہیں"۔ بادشاہ چونکہ فقیروں کے عاشق تھے۔ تعریف سُنتے ہی بے تاب ہو گئے اور فرمایا "فوراً بلاؤ" چنانچہ دو آدمی روانہ کئے گئے۔ جنھوں نے آکر عرض کیا "عالی جاہ شاہ صاحب کی تیوری پر طلبی کا نام سُنتے ہی بل آ گیا۔ حضور وہ تو دُنیا کی ہر دولت سے بے فکر ہیں۔ اندیشہ ہے وہ شاید یہاں قیام بھی نہ کریں اور رات ہی رات کوچ کر جائیں"۔

عزیز الدین جیسا بادشاہ اتنا سنتے ہی کانپ گیا۔ اور فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہ ایسا نہ ہو فقیر کی دعا برباد کردے۔ کوٹلہ پہنچا تو یہاں فقیر کے بدلے اللہ کا نام تھا۔ پانچ آدمی پہلے سے تیار تھے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک شخص نے پیٹ میں خنجر بھونکا، دوسرے نے پشت میں، چند لمحہ میں بادشاہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے تو اُن کی لاش دریا کی طرف پھینک دی گئی۔ یہ واقعہ رات کے ابتدائی حصے میں ہوا۔ اتفاق سے رات چاندنی تھی اور بادشاہ کی خون آلودہ لاش جنگل میں پڑی تھی۔

مَیں اِذنِ عام کا ذکر پہلے کرچکا ہوں۔ جہانگیر کے عہد میں جس طرح ایک زنجیر لٹکتی تھی کہ ہر فریادی قلعہ شاہی پر حاضر ہو کر بادشاہ کو اپنی کہانی سُنا سکے۔ اِسی طرح اکبر کے تتبع میں عزیز الدین نے بھی یہ انتظام کیا تھا کہ وہ علی الصباح باہر آ بیٹھتا اور لوگ اُس کی زیارت کر لیتے۔

ایک برہمن عورت سا ام کو سا جمنا کے اشنان سے واپس آرہی تھی۔ پہلے تو ایک آدمی کو سوتا دیکھ جھجکی۔ مگر غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ لاش بادشاہ کی ہے اور خون بہہ رہا ہے۔ وہیں بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

رات کا بڑا حصہ اِسی طرح بسر ہوا، جب بادشاہ کی واپسی میں دیر ہوئی تو بقیہ اراکین دوزراء عزیز و اقارب پریشان ہوئے اور کوٹلے پہنچے۔ اندر جا کر

چپہ چپہ اور کونہ کونہ چھان مارا، فقیر کا پتہ چلا نہ بادشاہ کا۔ چاروں طرف ڈھونڈتے پھرے۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک لاش اور ایک عورت دکھائی دی۔ پاس پہنچے تو مفصل کیفیت معلوم ہوئی۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ صبح ہوئی تو نہلا دھلا بادشاہ کی لاش ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کی۔ شاہ عالم باپ کی جگہ تخت نشین ہوئے۔ رام کور برہمنی کو ان خدمات کا صلہ کہ اس نے رات کو بادشاہ کی لاش کی حفاظت کی سر دربار خلعت فاخرہ تھا۔ آج سے رام کور شاہ عالم کی بہن بنی۔ سلونو کے روز وہ بہن کی حیثیت سے سچے موتیوں کی راکھی جس میں سونے کی گھنڈیاں ہوتی تھیں بادشاہ کے ہاتھ میں باندھتی اور بادشاہ حقیقی بہن کی طرح اس کو زر وجواہر دے کر گھر سے رخصت کرتے۔ شاہ عالم کے بعد اکبر ثانی نے یہ تہوار بدستور منایا اور رام کور کی بڑی لڑکی ان کے ہاتھ پر راکھی باندھتی رہی۔ اکبر شاہ کے بعد بہادر شاہ نے بھی سلونو کو اسی طرح منایا۔ اور رام کور کے خاندان کو مالا مال کیا۔

برسات کا موسم کچھ ایسا دلکش موسم ہے کہ گرمی کی شدت سے پریشان وپژمردہ چھوٹے بڑے ہر دل میں آسمان پر گھٹا آتے ہی امنگیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ سلونو ساون میں ہوتا ہے جو یوں بھی دلچسپ مہینہ ہے۔ بشرطیکہ آج کی طرح تین چار روز کی بارش چاروں طرف سیلاب کی مصیبت نہ ڈھادے یہ جن دنوں کی باتیں ہیں ان دنوں میں پندرہ پندرہ اور بیس بیس روز موسلا دھار برستا تھا مولانا محسن مرحوم اپنے مشہور قصیدہ میں۔

راکھنیاں لیکے سلونو کی برہمن نکلیں نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڈھوا منگل

فرما رہے ہیں۔

"پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل"

یوں تو ساون بھر ہی قلعہ معلّٰی اور شہر بھر میں رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں مگر سلونو کا انتظام و اہتمام قلعہ میں آٹھ آٹھ دس دس روز پہلے سے ہوتا تھا جھولے پڑتے تھے اور کس تکلّف کے کھمبوں پر سنہرو پہلی پٹیاں جمی ہوئی ہیں، ریشمی رسیّاں ڈلی ہوئی، گنگا جمنی پٹریاں پڑی ہوئی، ایک طرف چولھے ایک طرف چوکے، کڑھائیاں چڑھی ہوئی، سامان بھرے ہوئے، ہندوؤں کا انتظام الگ، مسلمانوں کا الگ، اِدھر بادشاہ نماز سے فارغ ہوکر باہر آکر بیٹھے اُدھر برہمنی نے راکھی باندھی۔ برہمنوں نے اسیس دی، دربار نے دعاؤں کے نعرے بلند کئے۔ اور قلعہ اس صدا سے گونج اُٹھا۔

"مہابلی بادشاہ سلامت"

آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ لکھی باغ میں جہاں آج فٹ بال کے ساتھ خاک اُڑتی پھرتی ہے آموں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جامنوں کے گچھے ہوا میں جھول رہے ہیں۔ زمین پر کگروندوں کی بہار آسمان پہ بگلوں کی قطار دل کے پار ہوتی ہے پپیہا الاپ رہا ہے، کوئل کوک رہی ہے، نقارے پر چوٹ پڑی، کڑھائیوں میں بڑے پڑے، نفیری بجی اور جھولے والیاں جھولے میں آگئیں۔ پینگیں بڑھ رہی ہیں، جھوٹے مل رہے ہیں۔ دوپہر تک جھولے اور پکوان ہوتے رہے، کھانا کھایا،

اور بادشاہ سلامت نے اپنے ہاتھ سے زمرد بن چوڑیاں ایک ہاتھ میں پانچ، ایک ہاتھ میں تین اپنی ہندو بہن کے باندھیں۔ اور ساتھ والیوں کو جوڑے عطا ہوئے۔ نقد روپے دیتے گئے۔ مٹھائیوں، کچوریوں، پوریوں کے تھال عطا ہوئے، اور اس طرح یہ بہن، بھائی کے انعام واکرام سے مالامال شاہی جوڑا پہن کر سسرال رخصت ہوئی۔

میرا دلِ مبتلا خدا معلوم کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ ترقی کی روشنیاں اُس کو جگمگا سکتی ہیں نہ فیشنی چہرے اس کو گدگدا سکتے ہیں۔ جدت کا ہر ذرہ اس کے لئے مصیبت اور دورِ ترقی کا ہر قدم اس کے لئے آفت، جب عمر گذشتہ کی وہ پرلطف گھڑیاں یاد آتی ہیں اور عالمِ خیال مٹی ہوئی صحبتوں اور بچھڑی ہوئی صورتوں کو سامنے لاکر کھڑا کرتا ہے تو کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ میری آنکھوں نے اس سرزمین شاہجہاں آباد میں خلوص وایثار کے ایسے پھول مہکتے ہوئے دیکھے ہیں جو آسمان تک کو معطر کر رہے تھے۔

برہمنی اور بادشاہ کی داستانوں میں کیا ہے۔ اس کا فیصلہ آنکھوں والے دل کریں گے۔ میں تو مشرقی آدمی لکیر کا فقیر ہوں۔ دل مجروح اس وقت بھی ان کے اعمال پر سر دھن رہا ہے۔ زبان ساکت اور قلم خاموش ہے مگر قلب مضطرب نے دونوں فانی مکھڑوں کو انسانیت کی صف اول میں بٹھا کر کامیابی کے سہرے گلوں میں ڈالے۔ ٹھنڈے سانسوں سے ان کے ناموں کو بوسہ دیا اور دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔

کوٹلہ جہاں یہ واقعہ ہوا دو صدی پیشتر کیا ہو گا خبر نہیں۔ مگر میری آنکھوں نے اس کے در و دیوار دیکھے۔ جوانی میں کھنڈر دیکھا، بڑھاپے میں آراستہ۔ کھنڈر ایسا کہ اینٹوں کے ڈھیر اور مٹی کے انبار۔ قبروں کا نشان دیتے تھے، ورنہ زمانہ مکینوں کے ساتھ مکان بھی فنا کر چکا تھا مسجد تاراج ہو چکی تھی اور صرف مشرقی دیوار اور وسطی محراب کے آثار باقی تھے۔ مدرسہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی اور جدھر نظر جاتی تھی ٹوٹی پھوٹی قبروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ گیدڑوں کی آوازیں شام ہی سے گونجتی تھیں، اور ہوا پیپل کے ایک درخت کے پتوں میں سنسناتی ہوئی دُنیا کے اُن مہمانوں کا مرثیہ پڑھتی تھی جو کبھی زمین کے اوپر جا گئے تھے اور آج زمین کے نیچے سو رہے ہیں۔ ہر سمت سناٹا تھا۔ البتہ شام کے وقت عام طور پر اور خاص طور پر جمعرات کو ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے یا خوش اعتقادی کی، کچھ آدمی ان قبروں پر چراغ جلاتے دکھائی دیتے تھے۔

دوسرا دور دورِ حاضر ہے جس کا ہر شخص مدح اور ثنا خواں ہے۔ اِس لئے کہ وہ کھنڈر تھا یہ گلزار ہے۔ گلزار کے معنی ہیں آج کل پارک کے۔ فصیل اور آثار مدرسہ اور مشرقی دیواریں بدستور ہیں، لیکن بیچ کے تمام حصّہ میں سرسبز گھاس اور بجری کی سڑکیں ہیں۔

ایک کوٹلہ کیا ساری دِلّی ہی کی کایا پلٹ گئی۔ بھوت کا منبع، سعادت خاں کی نہر، چاندنی چوک کے درخت، بھوت کے منبع پر بائسکوپ ہے۔ موریوں میں سنگین عمارتیں چوک کی وسیع سڑکیں ہیں۔ اور خود شہر پردیسیوں سے کھچا کھچ

بھرا ہے۔ پُرانے خاندان مٹ چکے، جو دو چار باقی ہیں اُن کو عزت سنبھالنی مشکل ہے زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ چلچلاتی دھوپ اور لُو کے جھکڑوں میں جب بزاز کی دوکان پر ایک پردیسی پسینہ میں شرابور بیٹھا کپڑا دیکھ رہا ہوگا تو پشت پر ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا آئے گا اور جان میں جان آئے گی۔ اس کو کیا خبر یہ پنکھا وہ شخص جھل رہا ہے جو ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کے خاندان کا ایک فرد اور تخت شاہی کا حقدار ہے جس کے باپ دادا حکومت کر رہے تھے آج وہ بھیک مانگ رہا ہے اور جو خستانوں میں زندگی بسر کر گئے اُن کی اولاد ایک پیسہ کے واسطے لنگوٹی باندھے آتے جاتوں کو پنکھا جھل رہی ہے۔

دِلّی کا انقلاب انوکھا نہیں چشمِ فلک ایسے ایسے ہزاروں تماشے دیکھ چکی مگر خدا کی قدرت اس وقت نظر آتی ہے جب لوگ کہتے ہیں شہر منہ سے بول رہا ہے۔ دُنیا جو چاہے سو کہہ لے۔ شہر والوں سے پوچھو شہر کہاں نہریں بند ہوئیں، درخت کٹ گئے، عمارتیں ڈھے گئیں۔ اور وہ خاک جو اب بھی نظروں کے واسطے کیمیا تھی باقی نہ رہی ”جلیں پرائی دھیاں اور ہنسیں بٹاؤ لوگ“ دیکھنے والے اِس رونق کی داد دے لیں۔ مگر اس تعمیر کی ہر کدال اور ترقی کا ہر پھاوڑا دِلّی والوں کے کلیجہ پر پڑا ہے!!

میرے سامنے اس وقت جو سماں ہے وہ قریب قریب پچاس سال پہلے کی باتیں ہیں۔ دِلّی نئی نئی برباد ہوئی تھی، غدر کے بچے کھچے لوگ موجود تھے، قلعہ معلّٰی کے روزانہ جشن تو بادشاہ کے ساتھ ختم ہو چکے تھے مگر یہ

بچارے اب بھی جمعرات کے جمعرات اکٹھے ہو کر رنگ رلیاں منا لیتے تھے یہ ہی کوٹلے اور پیرِ غیب کی دکانیں تھیں۔ لیکن ان میلوں اور جھمگھٹوں کی جو بہار یہ در و دیوار لوٹ چکے ہیں وہ اب نصیب نہ ہو گی۔

شہر آبادی یعنی دلی بسنے تک (۱۸۵۷ء سے پہلے) جیٹھ بیساکھ کی ٹھیٹ گرمی میں جب چیل انڈا چھوڑتی ہے آسمان سے آگ برستی اور زمین سے شعلے نکلتے ہیں کوٹلے اور پیرِ غیب کی یہ کیفیت رہی کہ فجر ہی سے دکان داروں کے تمبو تن جاتے تھے دو رویہ دکانیں الگ الگ بازاروں میں منقسم ہوتی تھیں۔ ایک قطار حلوائیوں کی ہوتی تھی۔ انواع و اقسام کی مٹھائیاں پوری، کچوری، رائتہ، چٹنی، مربے، بیگن آلو مرچیں تلی ہوئی۔ دہی کھٹا، نمکین لونجی، اچار غرض ہمہ نعمت موجود ہوتی تھی۔ حلوائیوں کے بعد کنجڑوں کی دکانیں تھیں۔ جو اب سبزی فروش کہلاتے ہیں۔ ان بیچاروں کے پاس سیب، مربے، انگور تو نہ ہوتے تھے مگر جو ہوتا وہ ایسا کہ پھر ویسا نہ ملا، گنڈیریاں صبح ہی سے گلاب میں بسائی جاتی تھیں۔ جلیبیا، بیدانہ، شہتوت کیوڑے میں ڈبوئے جاتے تھے۔ جھمبریاں شہد سے زیادہ میٹھی۔ دریا پار کے خربوزے ریتی کے شہیدی تربوز، پتلی پتلی ککڑیاں، ٹھنڈے کھیرے، قطب کی کھرنیاں، اندھیری باغ کے فالسے، رنجگی کے لوکاٹ گلاب میں بسے ہوئے، کیوڑہ چھڑکا ہوا، یہ وہ ترکاریاں تھیں جن کو دیکھکر آنکھوں میں طراوت اور دل کو فرحت ہوتی تھی اور سچ مچ گلاب کیوڑہ کے گھونٹ ہوتے تھے۔ ان سے آگے نان بائیوں کی دکانیں ہوتی

تھیں اور میاں شبراتی کے روے میدے کے پراٹھے اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اور آگے بڑھتے تو کبابی تھے۔ پیاز کا لچھا ادرک کی قاشیں پڑی اور سُرخ مرچیں چھڑکی ہوئی۔ گولے، سیخ، گولیاں، تتی ہر قسم کی موجود۔ المختصر جمعرات ایک خاصا اچھا بازار تھا جہاں کھانے پینے کی ہر شے موجود ہوتی تھی۔ درگاہ کے مغرب میں کھلونے لگتے تھے کہ بال بچوں والے خالی ہاتھ نہ جائیں۔ پانچ بجے سے میلہ شروع ہوتا تھا۔ حقّہ والے پتلی پتلی سٹکیں موتیا اور چنبیلی کے پھول لپٹے ہوئے جابجا کھڑے ہیں۔ ایک طرف مشاعرہ ہے دوسری طرف داستان ہے۔ کہیں پتنگ بازی ہے۔ کہیں جھولے ہیں۔ اور جس روز بادشاہ کی سواری آگئی تو خیرات بازار میں دوپہر ہی سے لنگر تقسیم ہو رہا ہے۔ چھ بجے کے بعد دنگل شروع ہوا، کشتیاں ہوئیں، کثرتیں ہوئیں، سامنے دریا میں تیراک ہیں۔ غرض ہر فن مولا اپنے اپنے کمال دکھا رہے ہیں۔ سقّے قدم قدم پر چکوئیوں اور اندارے کی مشکیں لئے کھڑے ہیں۔ یہ وہ پانی تھا جو برف کو شرمائے۔ کٹوروں کی جھنکار ایسی سریلی اور دلکش کہ خواہ مخواہ پیاس لگے۔ تعجب تو یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ہی یہ چیزیں بھی غارت ہوئیں۔ اب وہ پانی دیکھنے کیا سُننے میں بھی نہیں آتا اور اس جھنکار کو تو کان ہی ترس گئے۔ یہ تمام باتیں ان باکمالوں کے ساتھ ختم ہوئیں۔ اوّل تو وہ لوگ رہے ہی نہیں اور اگر کوئی مرا گرا ہے بھی تو جوتیاں چٹخاتا زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ خاندان تیموریہ کے ایک فرد مرزا فخرو جن کو توتلے ہونے کی وجہ سے سب فڑدو فڑدو کہتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ الف کے نام بے نہیں جانتے لاکھوں شعر سناتے ہیں۔ پتنگ بے مثل بناتے ہیں۔ چھ سات برس کی بات ہے۔ دِلّی اسٹیشن پر کسی رئیس کو شعر سنانے لگے۔ کیلنر کے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ میلے چکٹ کپڑے جوتی گھٹی ہوئی ٹوپی پھٹی ہوئی، جھوم جھوم کر شعر پڑھ رہے تھے۔ اُن کو یہ داد ملی کہ ہوٹل کے مینیجر نے ہاتھ پکڑ کر نکلوا دیا۔ غلطی رئیس صاحب کی تھی کہ شعر سننے کے واسطے بھی وہی جگہ رہ گئی تھی۔ ایک جاہل آدمی کا ایک سانس میں اساتذہ کے ہزار ہا اشعار ہر مضمون کے پڑھ دینا کمال نہیں تو کیا ہے۔ مگر اہل کمال کی جب یہ قدر ہو تو صاحب کمال کہاں سے اور کس برتے پر پیدا ہوں۔

گیارہ بجے رات تک جمعرات کا میلہ منتا تھا۔ ۵۷ء کے بعد بھی جمعرات کو اس کی نقل ہو جاتی تھی۔ اور لوگ جمع ہو کر شاہ جہاں آباد کی فاتحہ پڑھ لیتے تھے۔ اب وہ وضعداریاں ختم ہوئیں اور میلہ بھی فنا ہوا۔ یہ سرسبز و شاداب کوٹلہ جس کے ملاحظہ کو سیاح دور دور سے آتے ہیں میری آنکھوں نے اُجاڑ دیکھا ہے۔ اور اِس اُجاڑ میں جو بہاریں میں نے دیکھی ہیں وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اونچے اونچے ٹیلے کچّی پکّی قبریں۔ بڑے چھوٹے درخت مٹنے والوں کے داغ تازہ کر رہے تھے۔ دِل ان داغوں میں جو لطف لے رہا تھا۔ آنکھیں اس طراوت میں وہ فرحت نہیں پاتیں۔ وقت نے ان جانے والوں کی نشانیاں بھی مٹا دیں۔ قیامت خیز گرمیوں کی خاموش گھڑیوں میں یہ ہُو کا میدان اور لو کے

جھکڑ کبھی کبھی ٹھیک دوپہر کے وقت کوکو کے نعروں میں دل مجروح سے جو چھیڑ کر لیتے تھے وہ اب شبِ ماہ میں خوشنما گھاسوں کے قطعات پر گلاب و یاسمین کی شمیم انگیزیوں میں میسّر نہیں۔

راشد! بے وقت کا راگ گا چکے۔ حبِ وطن کے جذبات ختم کرو۔ دِلّی کا انقلاب انوکھا اور تغیّر نرالا نہیں۔ دُنیا ایسے ایسے سینکڑوں روپ بھر چکی۔ اور زمانہ ہزاروں سوانگ بدل چکا چشمِ فلک خدا معلوم اِس قسم کے کتنے تماشے دیکھ چکی۔ مردہ صورتوں کو رو چکے۔ زندہ چہروں پر نظر ڈالو، یہ زبانیں تغیّر کی پوری داستانیں سُنا دیں گی۔ ان کی ہر حرکت اور جنبش، ہر قول اور ہر عمل بجائے خود انقلاب کی تفسیر ہوگا ان کی رام کہانی اسلام کے معنی بھی بدل دے گی۔ جن دروازوں سے دونوں وقت لنگر تقسیم ہوتے تھے آج وہاں نفسانیت کا بازار گرم ہے اور جن کا وجود ایثار کا مکمل نمونہ تھا۔ ان کے نام لیوا مذہب مقدس کے احکام معاشرت اپنی ذات پر ختم کر رہے ہیں۔

اچھا! خاک کوٹلہ کے منتشر ذرّوں خدا حافظ! زخمی جگر کے بخارات قلبِ حزیں سے نکل کر ٹھنڈے سانسوں کی صورت میں اُٹھے اور آنکھوں سے سرشک بنکر نمودار ہوتے! خلوص کے یہ موتی کاغذ کی کشتی میں رکھ کر نذر دیتا ہوں! بزرگوں! تم خوش نصیب تھے کہ تمہاری خاک کو آنکھوں سے لگانے والے موجود ہیں اور اس وقت بھی کہ دُنیا کچھ سے کچھ ہوگئی تمہارا مرثیہ پڑھا جا رہا ہے! رونا اس وقت کا ہے جب

جہان آباد ان پاکیزہ جذبات سے قطعاً محروم ہوگا۔ خود غرضی کا ڈنکا چاردانگ عالم میں بجے گا۔ اور یہ شیر خوار طبیعتیں جو بوت کے پاؤں ہیں شباب پر ہوں گی۔

چوتھی نوبت

سالگرہ

جشنِ سالگرہ کی رسم ایک ہندوستان میں ہی نہیں دنیا کے ہر حصّہ میں رائج ہے اور عرصہ دراز سے منائی جا رہی ہے۔ کہیں اس کا نام سالگرہ ہے۔ کہیں اس نے جنم دن کا لباس پہنا۔ کسی جگہ روزِ پیدائش کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اور کہیں برس گانٹھ کے نام سے ظہور ہوا عہدِ ہنود میں جنم دن، والیانِ ملک کا کیا بچہ بچہ کا منایا جاتا تھا اور اب بھی دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس کو ان کے ہاں امتیاز حاصل ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تقدیرِ انسانی کا ستاروں اور بُرجوں وغیرہ کے تحت میں یقین رکھتے ہیں۔ اِس لئے بچّہ کی پیدائش کے ساتھ جنم پتری تیّار ہوتی ہے جس سے خوشی اور غم دونوں موقعوں پر مدد لیتے ہیں۔ ان کے تہواروں میں جنم اشٹمی کرشن کی پیدائش کا مشہور و معروف دن ہی۔ سلاطین مغلیہ میں بھی جب تک ان کا تزک و احتشام قائم رہا جشن سالگرہ دھوم دھام سے منایا جاتا رہا لیکن انحطاط کے ساتھ ہی جہاں دوسرے جلوس پر اوس پڑی، وہاں اس کا رنگ بھی پھیکا ہو گیا۔ عہدِ اکبری سالگرہ کے پھولوں سے پورے طور پر مزین ہے اور ایسا آراستہ و شاداب کہ اب بھی اس کی

خشک اور مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں ادبی دماغوں کو معطر کر رہی ہیں۔ دامنِ ہمایوں پر جو ہمیشہ صعوبت کے خاروں میں اُلجھا رہا اور چین نصیب نہ ہوا۔ یہ افشاں بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ لیکن قصرِ شاہجہانی ان قمقموں سے جگمگا رہا ہے۔ البتہ اورنگ زیب کا سیدھا سادھا دسترخوان ان تکلفات سے محروم ہے۔ اور گو اس کے بعد شاہی دسترخوان پر یہ چٹنی رگڑی گئی مگر نعمت بننے کو نہیں صرف منہ کا ذائقہ بدل لینے کو۔ عالمگیر ثانی۔ شاہ عالم۔ اکبر شاہ۔ بہادر شاہ بزرگوں کی یادگار کا استقبال تو ضرور کر لیتے تھے۔ مگر حق یہ ہے کہ ان بےبس بادشاہوں کی حکومت ہی ان بزرگوں کی لغزشوں کا خمیازہ تھی جنہوں نے قبل از موت ہی ان پر قیامت ڈھادی اور جیتی جاگتی اولاد کو گہری گور میں سُلا دیا۔

بہادر شاہ کا جشنِ سالگرہ بھی حقیقت یہ ہے کہ سلاطین مغلیہ کے شاندار اور پُرشوکت جلوس کی فاتحہ تھی۔ اور ایک لکیر تھی کہ پٹ رہی تھی۔ ورنہ وہ چیز جس کا نام مسرّت ہے اور جس کے پھریرے صِرف فضا آزادی میں لہرا سکتے ہیں کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ شاہانِ مغلیہ کے اس آخری تاجدار کا جشن سالگرہ جس کے بعد شاہجہان آباد کی آنکھوں کو یہ سماں دیکھنا نصیب نہ ہوا اور جس کے ساتھ شاہجہان آباد کے بسنے والوں کی بہت سی آرزوئیں ختم ہوئیں۔ اِس گئی گذری حالت میں بھی بزمِ فانی کا سُراغ

بتا رہا ہے۔ صحبت شب کی یادگار مرجھائے پھول اور بجھی ہوئی شمع کی نشانی پروانوں کی خاک موجود ہے۔ آسمان رات بھر الوداع کے پھول چڑھا چکا اور زمین وہ سماں پر دۂ دنیا سے رخصت کر چکی۔ اب یاد دوست بھی حصول دوست سے کم نہیں۔

سالگرہ کا دن ہے

کل جہاں پناہ کی سواری شام کو نکلے گی

ہندو، مسلمان، چھوٹا بڑا سالگرہ میں شریک ہو۔

ادب نگاہ روبرو! بادشاہ سلامت جہاں پناہ۔

(نقارہ کی آواز)

ایک! دو!! تین!!!

ہاں اے بہروپن دنیا اپنے کرشمے دکھا! اور ہمارے تماشے دیکھ دیکھے جا دکھائے جا ——— بڑھیا! نئے سرے سے جوان بن چوتھی کا جوڑ پہن! جوانوں کو لٹو بنا۔ بنے جا بنائے جا۔ کل جن کو پھولوں کی سیجوں پر سلا کر میٹھی لوریاں دیں، آج اُن کی خواب گاہ میں کانٹے بچھا دئے کل جن کے قدموں میں آنکھیں بچھائیں آج اُن کی بات بھی نہیں پوچھتی۔ کل جن کو سر آنکھوں پر بٹھا رہی تھی آج اُن کو خس و خاشاک کی طرح اڑا رہی ہے۔

ہاں ہاں پیر زال بنے جا بنائے جا

زمانہ کا زبردست ہاتھ اور وقت کی غیر معمولی طاقت تغیر اقوام کے آسمانی فیصلہ کی تصریح عملاً کر رہی ہے۔ دوستوں آؤ اور اپنا تماشہ دیکھو۔ معلوم ہے کس سرزمین پر کھڑے ہو؟ یہ وہ سرزمین ہے جس نے شاہجہاں اور اورنگ زیب کے قدم اپنی آنکھوں سے ملے۔ اکبر اور جہانگیر پر اپنے کلیجے کے ٹکڑے قربان کیے جس کی گود میں اب تک نورجہاں اور ممتاز محل کی ہڈیاں موجود ہیں۔ غور سے دیکھو وہی سرزمین اس وقت کس لاپروائی سے دیدے بدل رہی ہے۔ شیرشاہ اور ہمایوں کے معاملات فنا ہوئے۔ شاہجہانی حکومت ختم ہوئی۔ اکبری دور دورے ہو چکے۔ جہانگیری ڈنکا بج گیا۔ اب وقت فیصلہ قرآنی کی تفسیر کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ قوموں کے اعمال کس طرح اپنی حالت بدلتے ہیں۔

عیش خوروں بہت ہنسے، ہنس چکے، ہنسا چکے، کان لگاؤ اور آسمان کا نغمہ سنو ـــــــــــــ کھیل کے رسیلوں! بہت کھیلے دن دن کھیلے، راتارات کھیلے، دِنوں کھیلے۔ ہفتوں کھیلے، کھیل چکے، نظریں نیچی کرو، اور زمین کے آنسو دیکھو، یہ کلیجے سے منہ پر آئے ہیں۔ اگر پہلو میں دل اور دل میں درد موجود ہے تو تڑپو، تڑپو اور پڑھو۔

خدا نے آجتک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

سالگرہ کی تیاریاں تو دنوں پہلے سے ہو رہی تھیں۔ جب وہ رات آئی جس کی صبح کو جشن ہے تو شام ہی سے رنگ رلیاں شروع ہوئیں۔ قلعہ کی دیواروں پر چراغاں ہوا۔ درختوں میں قندیلیں اور قمقمے روشن ہوئے۔ مٹی کے چراغ ڈال ڈال اور پات پات نمودار ہوئے قلعہ کی زمین دِلّی کا آسمان بنی ہوئی تھی۔ ادھر ستاروں کی افشاں تھی ادھر چراغوں کی۔ جدھر نظر ڈالو روشنی ہی روشنی تھی۔ کہیں ابرک کے چوکھٹے تھے۔ کسی جگہ سبز سُرخ کاغذوں کے قمقمے۔ موتی مسجد میں جھاڑ فانوس دیوان خاص میں جھنڈیاں، دیواروں پر قندیلیں، منڈیروں پر دیوے، موم بتیاں، دیواروں میں کنول، صحن اور میدان محل اور دیوان ہر چیز بقعۂ نور تھی، روشنی موتیا کی گود میں، لالہ کے گھونگھٹ میں، چنبیلی کے دامن پر، گلاب کے رخساروں پر، غرض چمن روشنی کی آگ سے دہک جاتا تھا۔ جھروکے جنہوں نے شاہانِ مغلیہ کے منہ چومے خاص انداز سے روشن ہوتے تھے۔ پہلی قطار جھاڑوں کی، اس کے بعد ہنڈیاں طرح طرح کی اور رنگ برنگ کی اس کے آگے کنول۔ اس کے آگے پنج رنگی قلمیں۔ چھتوں پر ننھے چراغ، چھجوں پہ پنجیاں، غرض چپہ چپہ اور کونہ کونہ روشن ہوتا تھا۔

میرے مکرم دوست شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی بی اے جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے قلعہ کی پوری رام کہانی سُنی ہے اور جن کے پاس آخر وقت یہ تمام ذخیرہ موجود تھا فرماتے تھے

کہ سالگرہ کے اس آخری جشن میں جس کے بعد بادشاہ کو سالگرہ منانی نصیب نہ ہوئی۔ فروری کا مہینہ تھا، گلابی جاڑے تھے اور بسنت کی رُت موسم گرم تو نہ ہوا تھا لیکن خنکی کم ہو گئی تھی۔ اور بسنتوں کے میلے زور شور سے من رہے تھے۔ بھولو شاہ کی بسنت دو دن پہلے ہو چکی تھی۔ دِلّی والے میلوں کے رسیا، ڈھنڈورا سنتے ہی اُچھل پڑے، جمعرات کا دن تھا اور جمعرات بھی تو چندی۔ خلقت ایسی منڈی کہ قلعہ کے میدان میں اور دریا کے کنارے پر تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ شاہ بڑے سے لیکر راج گھاٹ تک آدمی ہی آدمی تھا۔ دُکانوں کے پردے، عورتوں کے چادرے، مردوں کے صافے، بچّوں کے کپڑے سب بسنتی تھے۔ حد یہ ہے قلعہ کے نیچے کھائی میں جو قندیلوں کی قطار تھی وہ بھی بسنتی تھی۔ غرض کونہ کونہ اور چپہ چپہ پر بسنت پھول رہی تھی۔ شہزادوں نے قلعہ میں، دُکان داروں نے میدان میں تبراکوں نے راج گھاٹ پر، قوالوں نے شاہ بڑے پر ڈیرے ڈال رکھے تھے اندر اور باہر، دریا پر اور خشکی پر رات بھر ناچ گانا ہو رہا، ستار سارنگی، طبلہ، مجیرے، نفیری، ترئی، بین، جلترنگ، غرض راگ راگنی کی مجسم تصویریں ہر جگہ جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ پچھلے پہر غبارہ بازوں کی سیر تھی۔ بسنتی کاغذوں کے سینکڑوں قدِ آدم غبارے روشن ہوئے اور ہوا میں چھوڑے گئے، چار بجے تک تو سارا آسمان بسنتی تھا، اور معلوم ہوتا تھا آسمان کی آنکھوں میں سرسوں

پھول رہی ہے۔ اب ایک دوسرا سماں تھا، سینکڑوں ہزاروں اگن کیسے کیسے خوش الحان جن کی آوازیں کلیجہ کے پار ہوں، پنجروں میں بند، لسنتیاں چڑھی ہوئی وداعِ شب کا پیام دیتے بیدار ہوئے کس کو خبر تھی کہ یہ آخری جشن ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شہر کی بہار ختم ہوگی۔ یہ پرندرات کا نہیں بہارِ شاہجہاں آباد کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ تین گھنٹے رات تک ایسا سناٹا چھایا کہ جہاں کان پڑی آواز نہ سنائی دے رہی تھی وہاں سانس کا بھی پتہ نہ تھا۔ جامع مسجد سے مؤذن کی آواز بلند ہوئی اور نمازی ادھر ٹوٹ پڑے۔ صبح ہوتے ہی نان بائیوں نے تندور روشن کئے۔ حلوائیوں نے بھٹیاں سلگائیں بھٹیاروں نے آگ جلائی، لباطیوں نے جھاڑو سنبھالی، کنجڑوں نے چھپے ٹھیک کئے ہنڈولوں اور چکروں کی چرچر ہونے لگی۔

ٹھیک نو بجے توپ چلی اور امراء و روساء کا داخلہ شروع ہوا۔ قدم قدم پر برقنداز سرخ پگڑیاں باندھے خاکی ٹپکے لگائے کھڑے ہیں۔ دیوان خاص منہ سے بول رہا ہے اور چاروں طرف سے اللہ رسول کی پناہ کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ داخلہ بند ہوا، دھونسے پر چوٹ پڑی، نقیب نے آواز لگائی "عملہ تورہ بورک رکاب حاضر"

بادشاہ برآمد ہوئے۔ آگے آگے حبشیوں کا دستہ اس کے بعد اردبیگنی، محافظ، بیچ میں بادشاہ سلامت۔ پیچھے جوان بلّم لئے ہوئے۔

حضور تخت پر رونق افروز ہوئے چوبدار نے آواز لگائی۔

"ادب نگاہ روبرو"

نذریں پیش ہوئیں سب سے پہلے شہزادگان والاتبار نے اپنی اپنی نذریں گذاریں۔ اس کے بعد امراء نے اور اس کے بعد رعیت نے۔

گیارہ بجے انعام واکرام تقسیم ہوئے۔ دربار ختم ہوا تو نوکروں چاکروں، بھنگی چماروں کو، ڈوم ڈہاڑیوں، سقّے دھوبیوں کو جوڑے بٹے اور جہاں پناہ اللہ رسول کے نعروں میں "تام جھام پر سوار ہوئے اور مینا بازار میں تشریف لائے۔

یہ زنانہ بازار ہے جہاں ہر دوکان دار عورت ہے۔ بسنتی دوپٹہ سر پر۔ سواری کی خبر سنتے ہی دوکان دارنیوں نے اپنے اپنے دوپٹے سنبھالے۔ رنگ برنگ کے جھنڈے اور جھنڈیاں اُڑ رہے اور لہرا رہی ہیں۔ دورویہ دُکانوں میں گہما گہمی ہو رہی ہے۔ اُجلے اُجلے سفید بابل لیٹ کے پردے دُکانوں کے اندرونی حصّہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ باہر کیکری کٹاؤ کے گاؤ تکیے، ماہی پشت کی سوزنیاں، رنگ برنگ کے گوٹے ٹپاپٹی کے پردے۔ مقیش کی جھالریں، گوکھرو کی لڑیاں، غرض مینا بازار کی ہر دوکان دُلہن بنی ہوئی ہے۔

حضور نے تمام بازاروں کا ایک چکر تام جھام میں کیا، کہیں کہیں ٹھٹکے بھی اور دونوں ہاتھوں سے سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے

بارہ بجے کی توپ چلی، لنگر تقسیم ہوا، محتاجوں کو، غریبوں کو، رانڈوں کو، یتیموں کو، جھروکے کے سامنے والے میدان میں اور امراء کو دیوانِ عام کے پاس۔ ظہر کی نماز سے فراغت پاکر حضور محل میں تشریف لائے۔

علہ تورہ یورک رکاب حاضر

کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ تخت پر قدم رکھتے ہی مونگ کی دال کا بڑا کٹرا ہائی میں ڈالا گیا، ولی عہد بہادر نے مجرا کیا، اور سرسوں کا پھول پیش کیا۔ صدقے کے کوّے چھوڑے گئے۔ ایک نیل کنٹھ سامنے لایا گیا۔ سات دفعہ صدقہ کیا اور اُڑا دیا۔

میراسنوں نے شادیانے شروع کئے، سہرے گائے۔ مبارکبادیں دیں، حضور نے انعام واکرام تقسیم کئے اور زنانہ دربار میں تشریف لے گئے۔

ملکہ عالیہ جن کا خطاب زینت محل تھا بیش بہا جواہرات زیب تن کئے تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ حضور کے تشریف لاتے ہی ادھر حبشنوں نے صدا دی۔

"اللہ رسول کی امان"

ادھر ملکۂ عالیہ تخت سے نیچے اُتریں اور محل کے دروازۂ خاص تک استقبال کو تشریف لائیں۔ ہز ہائنس محمد اشرف بی۔ اے مرحوم اپنے والد مغفور کی زبانی ان حالات کو اس طرح بیان فرماتے تھے۔

دروازہ پر ملکہ عالیہ نے دوہرے ہو کر آداب بجایا۔ حضور نے گردن جھکا کر جواب دیا اور تخت کی طرف چلے۔ شہزادیوں نے

حضور اور ملکہ عالیہ کو اپنے بیچ میں لیا اور پچھلے پاؤں سے اس واسطے کہ بادشاہ کی طرف پشت نہ ہو ایک ایک قدم چلنا شروع کیا۔ تخت کے قریب پہونچ کر یہ سب کائی کی طرح پھٹ گئیں اور دو دو قطاریں ہو کر دست بستہ مجرا کیا۔ ان کے جسم جواہرات سے جگمگا رہے تھے۔ ملکہ عالیہ کا پاجامہ جو زربفت اور کمخواب کا تھا اس کے پائنچے دس گز سے کم نہ تھے اور کئی چھوکریاں اُن کو ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے تھیں۔ ملکہ حضور کے برابر تخت پر تھیں۔ ایک جڑاؤ مرصع جھومر جواہرات سے لپا ہوا تھا اور جس کی لڑیوں میں لعل و یاقوت لٹک رہے تھے ماتھے پر تھا۔ لباس دیبا و حریر کا تھا۔ زیور کی چمک دمک آفتاب کو آنکھ مار رہی تھی۔ ملکہ عالیہ نے طلائی خاصدان میں نقرئی ورق لپیٹی ہوئی گلوریاں پیش کیں، حضور نے پان نوش فرمایا اور اسکے بعد زنانہ نذریں پیش ہوئیں۔ شہزادیوں کا لباس بسنتی تھا اور اور کوئی شہزادی ایسی نہ تھی جس کا دوشالہ بسنتی نہ ہو۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بسنت یہاں پھول رہی ہے۔ ملکہ عالیہ کے ہاتھ میں رومال بھی بسنتی تھا۔ نذروں کے بعد حضور نے زنانہ انعام تقسیم فرمائے۔ توپ چلی، دھونسہ بجا۔ اور حضور تام جھام میں سوار ہو کر باہر تشریف لائے۔ ہوادار طیار تھے۔ ملکہ عالیہ ایک میں اور حضور دوسرے میں سوار ہوئے۔ فوج کے پرے آگے تھے۔ جلوس

قلعہ معلّٰے سے چلا اور شہر کا چکر لگاتا ہوا مغرب کے وقت جامع مسجد پہونچا۔ نماز پڑھی اور اسی شان و شوکت سے قلعہ میں داخل ہوئے۔

ہجوم افکار

تخیل نے دور بہار کے مزے خوب لوٹے۔ داستان شاہی کے بیان میں پیٹ بھر کر گل و بوٹے کھلائے، اور جی کھول کر پھول پتیاں لگائیں، اب وہ سماں ختم ہوا، خزاں کے آثار نمودار ہیں — دہکتا ہوا لالہ، دغدغاتا ہوا گلاب، مہکتی ہوئی چنبیلی سب نذرِ اجل ہوئے۔ غدر ۵۷ء کی آندھی ایک قیامت تھی جس نے بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکے! کیسے کیسے سدابہار پھول جن کی بھینی بھینی اور مست خوشبوؤں نے در و دیوار معطر کر رکھے تھے۔ ایسے تاراج ہوئے کہ نشان تک نہ رہا۔ قلعہ معلّٰی کے عالیشان قصر ڈھنڈار ہوئے۔ اور سر بفلک بارہ دریوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

دماغ کا دور دورہ جہاں حُسنِ عقیدت رنگ برنگ کی نذریں چڑھا رہا تھا ہو چکا، اب آنکھوں کا تسلط ہے اور یہاں کا ذخیرہ قطراتِ اشک ہیں جو جہاں آباد کے انقلاب اور بادشاہ کی مصیبت پر پٹ پٹ گر رہے ہیں۔

تاجدارانِ مغلیہ کے اس آخری بادشاہ کی آزادی تو مدتیں ہوئیں رخصت ہو چکی تھی، وہ کہنے کو بادشاہ تھا مگر صرف اتنا کہ قلعہ میں رہ کر اپنی زندگی کے دن پورے کرے اور سچ پوچھو تو یہ کچھ ایسی چیز نہ تھی جس سے بادشاہ بے خبر ہوتا، وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ نمک حرام احباب میری آڑ میں اپنا کام بنا رہے ہیں۔ اور گو بظاہر ان کی زبانیں میرا کلمہ پڑھ رہی ہیں مگر ایک بات بھی اُن کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے تو تیوری پر بل آجاتا ہے اور جب تک اپنی ضد پوری نہ کرلیں نگاہ ٹھیک نہیں ہوتی۔ مگر مجبور تھا کہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی کہ یہ سب کچھ گوارا تھا مگر ان کی ناخوشی گوارا نہ تھی۔

بہادر شاہ کی پہلی بدبختی تو یہ تھی کہ بادشاہی کے لالے پڑے۔ اکبر شاہ ثانی نے آخری عمر میں سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ اس کے بعد مرزا جہانگیر بادشاہ ہو۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی اور مرزا لولو کہنے کے جرم میں گرفتار کیے گئے تو اکبر شاہ نے مرزا مغل کو منتخب کیا۔ غرض ساٹھ برس کی عمر میں بہادر شاہ بادشاہ بنے۔ دو لاکھ روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر ہوا۔ ڈیڑھ لاکھ روپے سال کی آمدنی کوٹ قاسم کی تھی کچھ شاہی کرایہ تھا۔ المختصر شاہی کی ساری

کائنات یہ ڈیڑھ پونے دو لاکھ روپیہ ماہوار کی آمدنی تھی۔ بڑھا ہوا حوصلہ، کھلا ہوا ہاتھ۔ دل کی یہ کیفیت کہ کوئی سائل خالی اور کوئی مصیبت زدہ ناکام نہ جائے۔ مگر خیر یہ مالی دقتیں کسی نہ کسی اور بُری بھلی طرح رفع ہو رہی تھیں۔ قیامت خیز کچوکے اور جگر خراش برمے ان خود غرضوں کی ضدیں تھیں جو کھار ہے تھے اور غرّا رہے تھے۔ ذرا ذرا سی بات میں فرنٹ ہوتے تھے اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں اکڑ بیٹھتے تھے۔

اوّل تو تخت ہی سے نااُمیدی ہوئی اور جوانی بڑھاپا اسی نااُمیدی میں گذرا۔ موت کے ساتھ شاہی کی جھلک دکھائی دی تو وہ اس رنگ کی کہ گھر بار کے مالک مگر اندر قدم نہ رکھنا۔

حقیقت یہ ہے کہ بھادر شاہ کے واسطے بادشاہی پیش خیمہ تھا اُن مصائب کا جن کو سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، تمہید تھی اُن آفات کی جو خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ آغاز تھا اُن حوادث کا جنھوں نے اس بدبخت کے مجسمہ کو تکالیف اور ابتلا کی پوٹ بنا دیا۔ روحانی و جسمانی ہر قسم کے ایسے ایسے صدمات نازل ہوئے کہ جینے سے جی چھوٹ گیا۔ بادشاہ ہی کا حوصلہ تھا کہ ہر موقع پر مردانہ وار سینہ سپر ہوا۔ اور توپ و تفنگ کے سامنے قدم نہ ڈگمگائے۔

تعجب ہوتا ہے اُن لوگوں پر جو قسمت کے مارے بھادر شاہ کے اقوال و افعال پر نکتہ چینی کرتے اور ملزم ٹھیراتے ہیں۔ فطرت انسانی

ان کی عقلوں پر ہنستی اور ایمان ان کے فیصلوں کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ ایک شخص کا گھر بار چھپتا ہے۔ مال و متاع ضبط، قوت سلب ہر سمت سے مصیبتوں کا ڈھیر اور پریشانیوں کی آواز۔ خیر خواہ اور قدیمی نمک خوار طوطے کی طرح دیدے بدل رہے ہیں۔ مگر اتنی مجال نہیں کہ اُف کر سکے، خاموش دیکھے جو سامنے آئے۔ اور چپکا انگیزے جو سر پر پڑے، ذرا دم مارتا ہے تو وہ صحبت ہی درہم برہم ہوتی ہے اور جس سے بگڑتا ہے وہ دونوں صورت نہیں دکھاتا اور آکر جھانکتا تک نہیں۔ المختصر وہ فضا ہے جہاں ہوا کا ہر جھونکا بھی زخمی دِل پر تیر برسا رہا ہے۔ دن اسی ادھیڑ بن میں اور رات اسی رنج و غم میں بسر ہوتی ہے، بھوک ہے نہ پیاس، چین ہے نہ آرام، بدبختی کی ایک تصویر ہے جو ہر لمحہ آنکھ کے روبرو ہے بادشاہی اور حکومت کیا ایک مصیبت ہے جو سر سے پاؤں تک چھا رہی ہے اور ایک بلا ہے جس سے کسی طرح چھٹکارا نہیں۔

ستر برس کا سترا بہترا انسان عقل درست نہ حواس ٹھکانے۔ ہجوم افکار کا یہ زور اور آفات و مصائب وہ کچھ، بھولے بسرے کبھی کچھ مسرت کے لمحے میسر ہو جاتے تھے تو ملکہ زینت محل کے پاس بیٹھکر یا شاہزادہ دارا بخت کو پاس بٹھا کر۔ تقدیر نے یہ خوشی بھی مٹادی اور مظلوم بادشاہ پر بڑھاپے میں وہ ستم ٹوٹا کہ الامان الحفیظ۔

۱۵ ستمبر ۱۸۵۶ء کی صبح بڈھے بادشاہ کے واسطے ایک نئی مصیبت لائی، یہ وہ آفت تھی جس نے مظلوم کی کمر توڑ دی۔ زندگی کے ارمان پورے اور اُمیدیں قریب قریب ختم ہو چکی تھیں۔ اب اگر کوئی توقع یا سہارا باقی تھا تو زینت محل جیسی ملکہ یا دادا بخت جیسے ولی عہد کے دم سے جن کو دیکھ کر ڈھارس بندھتی اور دل کا کملایا ہوا کنول ہرا ہو جاتا۔

نماز فجر پڑھ کر بادشاہ موتی مسجد سے باہر آئے! ہائے موتی مسجد کا خیال آتے ہی گھونسا سا لگ گیا۔ (کبھی کوئی بھولا بھٹکا مسافر پہنچ جائے تو معلوم ہو کہ فانی دُنیا میں کیا کیا چیزیں صاحب قرآن ثانی کے گیت گا رہی ہیں) حکیم احسن اللہ خاں نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر مجرا کیا اور آنکھیں بند کر کے حلقہ بگوش ہونے کا اعتراف کرنے کے بعد عرض کیا۔

"ولی عہد بہادر سیجوں پر ہیں" (حالت نازک ہے)

اتنا سُنتے ہی ہوش اُڑ گئے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ بڈھے باپ کے دل پر کیا گذری ہو گی اور کس طرح محل سرا تک راستہ طے کیا ہو گا۔

حضرت مرزا ابلاقی مرحوم جن کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے فرماتے تھے، میرا بچپن تھا اور میں اس وقت وہاں موجود تھا۔ داسا بخت کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑ رہی تھی اور محل میں کُہرام مچا ہوا تھا۔ جہاں پناہ

داخل ہوئے تو چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے حضور کا منہ کبھی خشک نہ دیکھا۔ کچھ ایسی گرمی بھی نہ تھی۔ بھویاں بھویاں پھوار پڑ رہی تھی اور آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا حضورِ عالی سیدھے ولی عہد کی مسہری پر پہونچے اور دوّا دوّا کہکر دو تین آوازیں دیں۔ تشنج اعضاء شروع ہو چکا تھا، اور دماغ درست نہ تھا۔ بدبخت باپ نے گرفتار موت بچّہ کا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر آنکھوں سے لگایا اور کئی دفعہ پکارا لیکن سب بے سود تھا۔ اب بہادر شاہ کو پورا یقین ہوگیا کہ دارابخت تھوڑی دیر کا باپ کے پاس مہمان ہے۔ حکیم و طبیب خاموش کھڑے تھے۔ دوا برابر دی جا رہی تھی مگر بے کار یہاں تک کہ دارابخت کا سانس باپ کے سامنے بگڑنا شروع ہوا۔ ملکہ زینت محل فرماتی ہیں کہ محبّت سے بیتاب ہو کر بادشاہ نے دارابخت کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ آنکھ سے آنسو گر رہے تھے۔ جس وقت باپ نے بیٹے کے ہاتھ اپنے گلے میں ڈال کر چہرہ پر ہاتھ پھیرا تو بیمار نے آنکھیں کھول دیں۔ ہم سب برابر کھڑے یہ کیفیت دیکھ رہے تھے۔ ہمارے دلوں پر جو کچھ گزر رہی تھی بیان نہیں ہو سکتا۔ دارابخت کی آنکھیں کھولتے ہی بادشاہ کے دل کی حالت بالکل ہی بگڑ گئی۔ اُنہوں نے بچّہ کے مُنہ پر مُنہ رکھ دیا اور ایک چیخ مار کر کہا۔

"دوّا کیا کر رہے ہو"

دارا کا دماغ درست نہ تھا۔ آثار موت نمودار ہو چکے تھے۔ بڈھا باپ جوان بچہ کو لپٹ لپٹا کر دنیا سے رخصت کر رہا تھا۔ آنکھ میں آنسو نہ تھے۔ مگر چہرے کی شکنیں قلب کی کیفیت کا پتہ دے رہی تھیں۔ اُٹھتا تھا بیٹھتا تھا، منہ پر ہاتھ پھیرتا تھا اور سنبھلتا تھا۔ بہادر شاہ کا یوں تو بادشاہی مصیبتوں ہی نے خاتمہ کر دیا تھا اور شاید ہی کوئی لمحہ ایسا جاتا ہو کہ یہ بلبل ہزار داستاں جس کی نواسنجیوں نے لکھو کھا دل مسخر کر لئے تھے اور جس کی عمر کا بڑا حصہ ہنسنے بولنے میں بسر ہوا اپنے جگر خراش نالوں سے دوسروں کو نہ تڑپاتا ہو۔ لیکن ان صدمات نے کچھ کمر توڑ دی کہ بادشاہ غم کی ایک تصویر تھا۔ جس کا ہر سانس اور ہر ادا رنج والم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شب کی آہیں اور دن کے نالے جو اشعار کے لباس میں مجلس قرطاس پر نمودار ہو چکے ہیں ہمیشہ جگمگائیں گے۔ اور چشم حقیقت بیں کو دکھائیں گے کہ عمر کے اس آخری حصہ میں بدنصیب بادشاہ کے دل پر کیا گذری ہوگی۔

مشہور شہزادی محمدی بیگم کی والدہ کہتی تھیں کہ جب ولی عہد کی حالت ردی ہوئی اور بادشاہ کو بچہ کی موت کا پورا یقین ہو گیا تو وہ آکر سرہانے کھڑے ہوئے۔ مریض کی صورت ٹکٹکی باندھ کر دیکھی جھکے اور بے تابانہ اپنا منہ بچہ کے منہ پر رکھ دیا، آنکھ سے آنسو جاری ہوئے۔ اُٹھے تو چکر آیا۔ بیٹھے اور چکرا کر گرے۔ سنبھلے

تو زار و قطار آنسو کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ حکیم احسن اللہ خاں کی آمد ہوئی اُنہوں نے نبض اور سانس دیکھکر گردن نیچی کرلی اور کہا "شہد دینا چاہیئے"۔

یہ بھی عجیب وقت تھا کہ بہادر شاہ کا جوان شیر جس کی جوانی دیکھنے دکھانے کے لائق تھی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا اور بدنصیب باپ جانکنی میں شہد ٹپکا رہا تھا۔

چار گھنٹے اِسی طرح بسر ہوئے ہر شخص پتھر بنا ہوا تھا۔ بدبخت باپ ایک ایک کا مُنہ حسرت سے دیکھتا تھا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ اِس مصیبت میں کام آجائے اور اس آگ کو جو اندر ہی اندر سلگ رہی ہے بُجھا دے۔ مگر یہ وہ پہاڑ تھا جو کسی کے سرکائے نہ سرک سکتا تھا۔ دوپہر کی توپ چلتے ہی بہادر شاہ اُٹھے۔ بچّہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور وضو کیا۔ آنسو جاری تھے اور ایک دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ وضو ٹھیک تھا نہ نماز، جانماز پر بیٹھے دعا مانگ رہے تھے۔ آتے تھے بچّہ کو دیکھتے تھے۔ کلیجے پر گھونسے مارتے تھے۔ اور روتے تھے۔

بالآخر وہ وقت بھی آگیا کہ دارا بہادر شاہ سے ہمیشہ کو جدا اور جوان لڑکے کی موت بُڈھے باپ کی اس کتابِ حیات میں جس کا خاتمہ مصائب و آلام کا مخزن تھا ایک ایسا باب کھول دے جس کی ہر سطر کلیجہ کے پار ہو، دارا کا دماغ بے کار ہوچکا تھا، وہ

باپ کے کرب و اضطراب اور عزیزوں کی گریہ وزاری سے قطعاً
ناآشنا اور بے خبر تھا اور اب اس جسم میں زندگی نام تھا۔ صرف
سانس کی آمد و رفت کا۔ جب یہ بھی بگڑا تو وہ تھوڑی بہت آس جو
سانس کے ساتھ جوشِ پدری نے لگا رکھی تھی ختم ہوئی اور ستم رسیدہ
باپ بچّہ کے سرہانے آکر کھڑا ہوا اور جب دل نے یقین کر لیا کہ دارا
کی صورت کچھ دیر بعد آنکھ سے ایسی اوجھل ہو گی کہ پھر نظر نہ آئے گی
اور بچّہ جس کی زندگی کے ساتھ جان لڑی ہوئی ہے قلعہ میں اور تھوڑی
دیر کا مہمان ہے تو بے تاب ہو کر اس کے سر کو بوسہ دیا اور چمٹ گیا۔ روتی
ہوئی آنکھوں سے دو دفعہ آواز دی مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ اب جاں کندنی
کے آثار جو دیباچہ تھے موت کا فنا ہو رہے تھے اور موت کے نشان جو
خبر تھے اس مبتدا کی نمودار ہو گئے تھے۔ باپ دیکھتا رہا اور اس کی
آنکھوں کے سامنے کلیجہ کے ٹکڑے کو پہلی ہچکی آئی پچھاڑ کھا کر گرا
اور ہوش آیا تو باقی کی دونوں ہچکیاں اور پرواز روح کے تمام
مراحل طے ہو چکے تھے۔

دارا کا صدمہ ایسا نہ تھا کہ بہادر شاہ بآسانی برداشت کر لیتا۔
اس بدبخت کا جگر وقت کے ہاتھوں سے پہلے ہی چھلنی ہو رہا تھا اور
ہر روز ایسے نت نئے شگوفے جو جلا کر خاک سیاہ کر دیتے کھلتے۔ کبھی قلعہ
چھوڑنے کا احباب مشورہ دیتے تھے۔ کبھی قطب بسانے کی صلاح۔
اس پر دارا کی موت بہادر شاہ کے زخمی دل پر ایسا کاری نشتر

تھا۔ جس نے ہوش و حواس زائل اور عقل و قیاس پریشان دئے۔

جوان بچہ کا داغ خدا دشمن کو نہ دکھائے۔ مگر فانی دنیا کے بسنے والوں میں سے جن آنکھوں نے یہ جگر خراش منظر دیکھا ہے وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ بہادر شاہ کے دل پر کیا گذری ہو گی۔ غدر کے پندرہ بیس برس بعد تک ایسے لوگ شہر میں موجود رہے ہیں جن کی ہر صبح بادشاہ کے نام پر آنسوؤں کی فاتحہ پڑھ لیتی تھی۔ رات کو بادشاہ کے وہ دردانگیز اشعار جو بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیتے تھے۔ کانوں میں پہنچ جاتے تھے۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ جس کا ہر لمحہ کل من علیہا فان کی تفسیر ہے۔ وہ چرچے ختم ہو گئے۔ اور آج وہ وقت ہے کہ بعض ہندوستانی غدر کا تمام بار اسی کے سر تھوپتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود شہر کی نوجوان نگاہوں میں مرنے والا بہادر شاہ سو ملزموں کا ملزم اور ہزار چوروں کا چور تھا۔ ہماری رائے میں ان حوادث اور مصائب کے بعد جو اس بادشاہ پر پڑے۔ صحت دماغ کی توقع ہی عقل سلیم نہیں کر سکتی۔ وہ بدبخت یوں ہی کچھ سیاست کا زیادہ اہل نہ تھا۔ اس پر افکار کا یہ ہجوم اور مصائب کا یہ طوفان الامان الحفیظ!

کس کو خبر تھی کہ تقدیر یہ وقت دکھائے گی کہ بڈھا بادشاہ تخت و تاج فنا ہونے کے بعد ملزم کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا ہو کر صفائی پیش کرے گا، مقدمے اور گواہیاں ہوں گی، جُرم اور صفائیاں ہونگی اور بدنصیب بڈھا جوان مُردوں کو ڈھوتا اور زندوں کو چھوڑتا جُمنا ترستا

رنگون پہنچے گا اور بغاوت کا جُرم ثابت ہو گا۔ اُن گواہوں سے جو اُسکا نمک کھا رہے ہیں۔

دارا کے بعد بہادر شاہ گوشت کا ایسا لوتھڑا تھا جس کی رطوبت ہر وقت آنسو بن کر ٹپکتی رہتی تھی۔ گھنٹوں اکیلا پڑا روتا تھا زیادہ جی گھبرایا تو باہر نکل عصا ہاتھ میں لئے قلعہ کی روشوں پر تنہا ٹہلتا۔ رات کو بارہا ایسا ہوا کہ سونے کے لئے لیٹا اور فراق کی آگ جب زیادہ تیز ہوئی تو اُٹھ بیٹھا۔ اور شیر کی طرح چاروں طرف دہاڑیں مارتا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ دارا کی موت سے پہلے قلعہ معلیٰ میں وہ طائر گرفتار تھا جس کی نواسنجیاں قفس کی تیلیوں سے ٹکرا کر فنا ہو رہی تھیں۔ دارا کی مفارقت ابدی نے قیدی کے دل و دماغ کا علاج طوق و سلاسل سے کیا۔ اور قلبِ مجروح پر ایسا نمک چھڑکا جس کی لذت تا دمِ واپسیں باقی رہی۔ یہ زخم مندمل تو نہ وقت کی طاقت سے ہوا۔ نہ صحبتِ احباب سے۔ ہاں اُس پر ایک قیامت خیز کچوکا اور ایسا لگا۔ جس نے بدبخت کے خرمن ہستی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ اور جیتے جی موت کا مزہ چکھا دیا۔ ۱۰ ار جولائی کا آفتاب دوسرے لڑکے کے واسطے پیامِ موت لایا۔ بھلا چنگا بچّہ دُکھ نہ درد، بیمار نہ سیمار، اچھا بھلا دوپہر کو باپ سے جدا ہو کر اپنی محل سرا میں گیا۔ بادشاہ نے ظہر کی نماز پڑھی۔ مسجد سے باہر نکلے تو

معلوم ہوا۔ ھمارا نے ہیضہ کیا۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ صرف زبان سے اتنا نکلا

"دیکھئے تقدیر کیا دکھاتی ہے"

محل سرا پہونچے تو بچہ کی حالت ردّی ہو چکی تھی۔ قلعہ میں ہیضہ کی واردا تیں اور بھی ہو چکی تھیں۔ اُس نے کم بخت باپ کے اور بھی رہے سہے حواس کھودئے۔ روزنامچہ شاہی میں لکھا ہے کہ مرزا فخرو فتح الملک کو خلاف عادت بھوک لگی۔ صفرہ کا زور سمجھ کر یخنی پی۔ فوراً قے اور اسہال شروع ہو گئے۔ مرزا الٰہی بخش نے جو فتح الملک کے خسر تھے، اُسی وقت حکیم احسن اللہ خاں کو بُلایا۔ اُنھوں نے نسخہ لکھا، دوا آئی، پسی، تیار ہوئی، تھوڑا زہر مہرہ حکیم نے اپنے پاس سے ملایا۔ مگر حالت سنبھلنے کے بجائے لمحہ بہ لمحہ بگڑتی گئی۔

زینت محل جو بادشاہ کی چہیتی بیگم تھی اور جس کا بچّہ جواں بخت غالب و ذوق کے سہروں کی وجہ سے مشہور ہے گیارھویں برس میں تھا۔ بادشاہ اور بیگم کی خواہش تھی کہ ولی عہد جواں بخت ہو مگر کامیابی نہ ہوئی اور فتح الملک ولی عہد مقرر ہوا۔ لوگوں کا خیال ہو کہ زینت محل نے کوئی بڑی رقم دے کر حکیم احسن اللہ خاں سے فخر الملک کو اِس واسطے زہر دلوایا کہ اس کے بعد جواں بخت ولی عہد ہو جائے۔

یہ خیال سچّا نہیں معلوم ہوتا اور غالباً قلعہ کی گپ ہے بہر حال

زہر دیا یا امرت، حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ کے ناسور پر جو ہر وقت رِس رہا تھا یہ ایسا ہاتھ پڑا کہ کلیجہ تک کھرچ دیا۔ جن آنکھوں سے ابھی دارا کے آنسو خشک نہ ہوئے تھے اور جن سے شب و روز ساون بھادوں کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں انہوں نے مرزا فخرو کو گرفتار موت دیکھا۔ حکیم اور طبیب تو اور ہیں سینکڑوں آدمیوں کا مجمع تھا۔ باپ بیٹے کو لپٹا پڑا تھا۔ ہر چند لوگ اٹھا رہے اور سمجھا رہے تھے لیکن وہ ہٹنا تھا نہ سرکتا تھا۔ لوگوں کا منہ تکتا، سینہ پہ ہاتھ مارتا، روتا بلبلاتا اور ٹکریں مارتا۔ بدقت تمام نماز عصر کے واسطے علیحدہ کیا اور کشاں کشاں مسجد میں لے گئے۔ مرزا الٰہی بخش جو مرزا فخرو کے خسر تھے جماعت میں شریک تھے۔ کہتے تھے کہ نیت باندھے چند لمحے گذرے ہوں گے کہ بادشاہ نے بآواز بلند ہائے کی اور چکر اکر گر پڑے۔ نماز اور دعا ختم ہوئی، مگر بدنصیب باپ کی بے ہوشی ختم نہ ہوئی۔ ہشیار ہوئے تو بلبلاتے ہوئے بچہ کی محلسرا میں پہونچے۔

فخرو کو آخری وقت کا تشنج شروع ہو گیا تھا اور کرب طاری تھا فرط شفقت میں بے تاب ہو کر باپ نے فخرو کی پیشانی کو بوسہ دیا اور رو کر کہا:۔

"بڑے دادا جان بیٹے پر صدقے ہوتے تھے، میں خوش نصیب کہاں کہ فخرو پر قربان ہو جاؤں"

ایمان کی آنکھیں اور انصاف کا قلم بہادر شاہ کی داستان مصائب پر جس قدر خون روئے جائز اور کم ہے۔ اس غریب کو اب زندگی کی کوئی حسرت باقی نہ تھی۔ اُمیدیں مایوسیوں سے اور توقعات ناکامی سے بدل چکی تھیں۔ مسرتوں کی جگہ افکار نے لے لی اور اُمنگوں کے بدلے آلام کی چھاؤنی چھا گئی۔ یہ وہ شاہی دل تھا جس کا کنول کبھی بھول کر بھی نہ کھلا۔ اور یہ وہ ہونٹ تھے جن پر مسکراہٹ کی نمود قسم ہوگئی۔ اگر قدرت کبھی بھولے بسرے یاد زندگانی سے فرصت دیتی تو برائے نام بادشاہی کی قرعات جونکیں بنکر خون چوستیں۔ اور ایک نہ ایک نشتر ایسا چبھتا کہ زندگی وبال ہو جاتی۔

پانچ بجے کے قریب مرزا فخرو کی حالت بالکل بدتر ہوگئی حکیموں نے جواب دے دیا۔ تیمار دار خاموش ہو گئے۔ باپ جس کا کلیجہ پہلے ہی چھلنی تھا مچھلی کی طرح تڑپنے لگا فخرو کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتا، اُس کے قدم چومتا، منہ پر ہاتھ پھیرتا، سینہ کو بوسہ دیتا۔ اور الگ ہوکر چیخیں مارتا، اور پھر جھپٹ جاتا۔ موت سے تھوڑی دیر پہلے جب بادشاہ کو پورا یقین ہوگیا کہ یہ عمر بھر کی کمائی لُٹ رہی ہے، آنکھیں اس صورت کو ترسیں گی اور کان اس آواز کو ترستے رہیں گے تو بآواز بلند کلمہ طیب پڑھا۔

مرزا فخرو پر مذہب اس قدر غالب تھا۔ اسے مذہب سے اس قدر

تعلق تھا کہ شہر کے اکثر نہیں بیشتر آدمی اُس کو وہابی کہتے تھے۔ وہ نذر نیاز وغیرہ کا قائل تھا اور نہ اِس قسم کے عقائد پر کار بند مگر صوم وصلوٰۃ کا سختی سے پابند تھا اور باوجود دولت و عزّت شباب واحباب کے اوراد ووظائف میں مصروف تھا۔ نہایت معتبر حضرات کا بیان ہے کہ جس وقت باپ کو بچّہ کی زندگی سے نااُمیدی ہوئی، آنسو خشک ہوئے اور دل نے صدادی کہ چھوٹا سا فخر جس کو گود میں پال کر اِس لئے جوان کیا تھا کہ باپ کی بقیہ عمر کو تاراج و برباد کرتا ہوا گہری گور میں سوجائے تو ناشاد و نامراد باپ جو چند روز پہلے ایک جوان شیر کو قبر میں لٹا چکا تھا بیٹے کے سرہانے کھڑا ہوا اور بآوازِ بلند کہا:۔

"اللہ اکبر"

باپ کے یہ الفاظ چند لمحے کے مہمان بچّہ نے سُنے اور جس طرح اُس کی گود میں الفاظ دُہرا کر بولنا سیکھا تھا اُسی طرح اس وقت بھی اعادہ کیا۔ خاموش دماغ نے بند آنکھوں سے اللہ اکبر کہہ کر باپ کو وہ وقت یاد دلایا جب تتلاتی ہوئی زبان ہنسار ہی تھی۔ اس کے بچپن کا خیال آتے ہی لڑکپن کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی اور جب یہ یقین ہو گیا کہ فخر نے چونکہ ہمیشہ سعادت مندی سے کام لیا۔ اور کبھی میرے حکم کی تعمیل میں تامل نہ کیا۔ اس لئے دمِ رحلت بھی دماغ اور زبان میرے حکم پر جھک رہے ہیں تو یہ ایسا چرکا تھا جس نے بڈھے

باپ کو بلبلا دیا۔ چیخیں مارتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر لوٹا اور سرہانے کھڑے ہو کر کہا۔

مرزا! اِس پھول سے جسم پر بعض دفعہ غصّہ میں
طمانچے لگائے ہیں۔ معاف کرتے جاؤ ——"

بہادر شاہ کے ساتھ سب کی ہچکی بندھ گئی۔ بارہ دری میں کہرام مچا ہوا تھا لیکن فخرا کو مطلق ہوش نہ تھا۔ جسم سرد ہو چکا تھا۔ اور سانس برائے نام باقی تھا۔ محبّت کے انتہائی جوش میں باپ آگے بڑھا اور بچہ کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ روح کو جو کچھ اذیت ہو رہی تھی باپ کے زانو پر سر رکھتے ہی ختم ہو گئی۔ اور مرزا فخرو بہادر شاہ کی گود میں ابدی نیند سو گیا۔

فخرا کے بعد باپ کی کیا کیفیت ہوئی بیان کرنی مشکل ہے۔ مگر بہادر شاہ کی اس حالت اور کیفیت کو دیکھنے اور سننے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عشرت و آلام حیات کا تعلق خالق سے کس حد تک ہے۔ اگر فلسفۂ حیات اس کا ذمہ دار صرف دنیا یا حالات و واقعات کو قرار دیتا ہے، تو زندگی کا یہ کارخانہ اس مداری کے کرتبوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جو بے موسم کے آم تماشائیوں کو کھلوا دیتا اور مٹی کا کبوتر بنا کر بلّی سے چٹ کروا دیتا ہے۔

اگر اعمال و افعال انسانی کے جزا و سزا کا اس عالم میں یقین رکھنے والا گروہ صحیح ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ باپ دادا اسکڑ دادا

پہلے دادا، دوسرے دادا، تیسرے دادا سے لے کر حضرت آدم ؑ تک کس کس کے گناہوں کی پاداش بھادر شاہ کو بھگتنی پڑی۔ وہ فرشتہ نہ تھا۔ پیغمبر نہ تھا۔ ایک انسان تھا۔ خطا و قصور سے مرکب اور سہو و نسیان سے لبریز۔ لیکن شیطان نہ تھا کہ اتنا راندۂ درگاہ ہوجاتا کہ کائنات کا ہر ذرّہ اس کا دشمن ہوتا۔ زندگی کی ہر خوشی اس کے واسطے مصیبت ہوتی، اور دُنیا کا ہر لمحہ اس کے واسطے نئی آفت لاتا۔

ہسٹری آف انڈیا (تاریخ ہندوستان) کے مصنف کا اگر یہ فیصلہ صحیح ہے کہ وہ عشرت پسند تھا۔ کاہل تھا۔ تو ہر وہ انسان جس کی عقل صحیح اور ایمان درست ہے اس رائے سے متفق ہوگا کہ بھادر شاہ جن آفات کا شکار ہوا وہ آدمی کیا فرشتہ کی عقل بھی زائل کر دیتیں۔

یہ قیامت نہیں تو کیا ہے کہ شاہ جہاں آباد پر راج کرنے والا بھادر شاہ اپنے ہی عزیزوں ماتحتوں کا محتاج ہو جائے سلطنت اور حکومت فنا ہو ہاتھ ٹکنے والے سر پر چڑھتے ہیں۔ عزیز و اقارب فرنٹ ہوتے ہیں۔ دوست احباب دشمن بنتے ہیں۔ جوان جوان بچے آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ جاتے ہیں۔ ہر صبح ایک نئی مصیبت اور ہر شام ایک انوکھی آفت پیدا کرتی ہے۔ اِس ظلم پر ظلم اور قیامت پر قیامت یہ ہے کہ ہر قول جرم، ہر فعل خطا اور ہر بات

تقصیر سمجھی جاتی ہے۔

دادا اور فخر بہادر شاہ کے دونوں بچے جو قلعہ معلّٰی میں دولہا بنکر داخل ہوئے تھے۔ ان ہی دروازوں سے کفن پہن کر رخصت ہو چکے اور جن دلہنوں کے گھونگٹ شاہی ہاتھوں نے اُٹھائے۔ آج اُن ہی کو بادشاہی آنکھیں رنڈسالہ پہنے دیکھ رہی ہیں بچّوں کی ہڈیاں گل کر خاک ہو چکیں۔ مگر ان کی یادگار بہادر شاہ موجود ہے۔ جو انسان نہیں ایک تصویر ہے اور بے حس و حرکت ہو کر بھی اپنی داستان سے دوسروں کو تڑپا رہا ہے۔

شہر آبادی کی ایک جھلک

کہتے ہیں دِلّی سات دفعہ بنی اور بگڑی۔ خدا معلوم کہنے والوں نے بننے بگڑنے کے الفاظ کس معنی میں استعمال کیے ہیں۔ سُنی سُنائی کہی یا آنکھوں دیکھی۔ خوش قسمتی سے مجھے دونوں رنگ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مگر میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ بہتر رنگ کونسا تھا اور بدتر کونسا۔

اُجڑی ہوئی دِلّی یعنی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کا ابتدائی دور میرا بچپن تھا۔ اور بعض باتیں خواب سی یاد ہیں۔ بعض اچھی طرح اور بعض نہایت اچھی طرح۔ بنی ہوئی دِلّی یعنی دارالحکومت میرا بڑھاپا ہے۔ ترقی کی ہر منزل ذہن میں محفوظ۔ آنکھوں میں سمائی ہوئی اور خیال میں بسی ہوئی ہے۔ مگر جس طرح دِلّی پر ترقی اور تنزل دونوں کے اطلاق میں کلام ہے۔ اسی طرح متحیّر ہوں کہ کہنے والے بننے اور بگڑنے کے کیا معنی لیتے ہیں۔ ۱۸۶۳ء کے موسم برسات میں جب دِلّی نئی نئی بگڑی تھی۔ غدر کو چھ سات سال ہوئے تھے اور پھانسیاں ملزمان شاہجہان آباد کو موت کے گھاٹ اُتار چکی تھیں۔ جو باقی تھے وہ تباہ و تاراج روٹی کے ٹکڑے کو محتاج۔ شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی میاں صاحب کی سالی رقیہ خانم مرحومہ کے ہاں کسی لڑکی کو درد زِہ شروع ہوا۔ ساون کا مہینہ تھا اور تیرہ روز سے جھڑی لگی ہوئی

تھی۔ مکانوں کا ستھراؤ ہو رہا تھا۔ برساتی شب برات تھی کہ ہر طرف سے دھواں دھوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ اس بلا کی موسلا دھار بارش اور پوروا ہوا تھی کہ بڑے بڑے سنگین مکان بول گئے۔ حاملہ کو درد شروع ہوا تو نصف شب گزر چکی تھی اور پانی دھونتال پڑ رہا تھا۔ جس کمرہ میں وہ لیٹی تھی اُس کی چھت پر ایک عظیم الشان دیوار گرنے کی طیاریاں کر رہی تھی اور اس کا گرنا اس چھت ہی کا کیا سارے گھر ہی کا فنا ہونا تھا۔ صاحب خانہ ایک بیوہ بی بی تھی۔ اتنا پتہ لگتے ہی محلہ والے تہمنیں باندھ لالٹینیں لے چھت پر آ پہونچے۔ اور دیوار کو اتارنا شروع کیا۔ اِس گروہ میں معمولی غریب غربا کے ساتھ مولوی محی الدین جج ہائی کورٹ حیدر آباد' کارخانہ دار فیاض الدین صاحب اور سیٹھ محفوظ علی تاجر کلکتہ بھی تھے۔ دیوار بڑی تھی اور چھت چھوٹی۔ تھوڑی دیر میں بھر گئی۔ رات کے ایک بجے لڑکا پیدا ہوا۔ اور اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ زچہ کو کسی طرح دوسرے مکان میں منتقل کیا جائے۔ مُنہ سے نکالنے کی دیر تھی، بختیاور کہار پینس لے کر آ موجود ہوا۔ مگر پالکی گھر کے اندر نہ جا سکتی تھی۔ فوراً دو تین ڈولیاں آ گئیں۔ اپنے محلہ سے بھی اور پر محلہ سے بھی۔ زچہ کی پالکی کے ساتھ خاصی برات تھی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر سب کچھ ہو گیا۔

یہ اُجڑی ہوئی دلّی کا واقعہ ہے' اب بنی ہوئی دلّی کی داستان

اس طرح شروع ہوتی ہے۔ ہمیں پچیس برس کا ذکر ہے میں علی گڑھ
سے دہلی آرہا تھا۔ چلنے لگا تو ایک صاحب نے جو عزیز ہیں اور وہاں
ملازم مجھے فرمایا کہ میرے بال بچوں کو ساتھ لیتے جاؤ۔ چنانچہ ہم سب
تیار ہو کر اسٹیشن پر آئے تو معلوم ہوا کہ کل دربار ہے۔ اور گاڑی
کے اول و دوم و درمیانہ درجہ میں مطلق جگہ نہیں اور یہی حال
تیسرے درجہ کا ہے۔ المختصر جوں توں ٹکٹ خریدے اور گاڑی میں
کھڑے ہو گئے۔ راستہ میں کیا گذری اس سے قطع نظر کر کے
دلّی پہنچے۔ تو واقعی شہر دُلہن بنا ہوا تھا۔ برقی روشنی نے چپّہ چپّہ
جگمگا دیا تھا۔ ہم سب اُتر کر باہر پہنچے۔ گاڑیاں اور تانگے تھے تو سینکڑوں
مگر پرانی اور نئی چھاؤنی، قلعہ اور سلیم گڑھ کے سوا کوئی جگہ ہی
اُن کی زبان پر نہ تھی۔ میں نے ہر چند کوشش کی اور سب سے کہا
مگر سواری میسّر نہ ہوئی۔ مجبوراً کچھ ذی اختیار حضرات سے
التجا کی۔ بنی ہوئی دلّی اور تعلیم یافتہ لوگ تھے کیوں توجہ فرماتے۔
جو صاحب سواریوں میں تشریف فرما تھے اُن سے درخواست کی
وہ ہنسکر آگے بڑھ گئے، بڑی مصیبت یہ تھی کہ جو بیوی ہمراہ تھیں
وہ نہ صرف حاملہ تھیں بلکہ مدّت حمل پوری کر کے وضع حمل کے
واسطے گھر جا رہی تھیں۔ دو ڈیڑھ میل جگہ عجب کشمکش میں تھا۔
تین چھوٹے چھوٹے بچے۔ سات آٹھ عدد اسباب دس بجے کے
اُترے اُترے رات کا ایک بج گیا مگر قلی میسّر نہ ہوا! آباد دلّی کا

کرشمہ تھا کہ میدانِ حشر کی طرح نفسی نفسی پڑ رہی تھی۔ شاید ہی وہاں کوئی مسلمان میری التجا سے بچا ہو۔ مگر کسی نے ذرہ بھر ہمدردی نہ کی۔ خدا خدا کر کے چار نلی آٹھ روپے پر رضامند ہوئے۔ شہر میں آیا تو فتح پوری، چاندنی چوک اور قلعہ کی سڑکیں بنیچوں سے پٹی پڑی تھیں کہ صبح اپنے حکمراں کی مبارک صورت کے درشن کریں۔ برقند ازوں نے ٹوکنا شروع کیا۔ اُن سے پیچھا چھڑا ٹھنڈی سڑک پر پہنچا۔ قافلہ ساتھ تھا اور حاملہ بیگم جوتیاں چٹخاتی ساتھ چلی جا رہی تھیں۔ چیلوں کے کوچہ جانا تھا۔ محلّہ میں قدم رکھتے ہی ایک عزیز ملے۔ گو رشتہ دور پرے کا تھا، مگر انسان تھے اور مسلمان۔ ساری رام کہانی سننے کے بعد فرمایا۔ "معاف کیجئے گا میں ایک ضروری کام کو جا رہا ہوں" گھر پہونچکر پردیسن پر کیا گذری یہ تو خبر نہیں۔ صبح معلوم ہوا کہ لڑکا پیدا ہوا۔ یہ بچہ اب بی۔ اے میں ہے یا بی۔ اے پاس کر چکا ہے۔ اور وہ عزیز صاحب بھی جنہوں نے فرمایا تھا "معاف کیجئے" زندہ ہیں اور ایک جلیل القدر عہدہ سے پنشن لی ہے۔

اب یہ فیصلہ سننے والوں کا کام ہے کہ بنی ہوئی دِلّی کونسی تھی اور اُجڑی ہوئی کون سی۔ راتیں دونوں گذر گئیں۔ پہلی زچّہ کی بھی اور دوسری کی بھی۔ بچّے دونوں کے ہوتے اِس کے بھی اور اُس کے بھی۔ لیکن کچھ باتیں باقی ہیں وہاں بھی اور یہاں

بھی۔ مولوی محی الدین خاں جن کی ہڈیاں گل کر خاک ہو چکیں، دھونتال مینہ میں ایک مسلمان پڑوسن کی خدمت آدھی رات کے وقت کر گئے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب جو "معاف فرمایئے" فرما کر آگے بڑھ گئے۔ ابھی زندہ ہیں۔ اور شاید دُنیا اب اُن کو ایسی خدمت کا موقع نہ دے۔

مُردے اور زندہ کا مقابلہ بگڑی اور بنی دلّی کا فیصلہ ہے پرکھنے والے بتا دیں گے کہ انسانیت کی کسوٹی پر کندن کون تھا اور پیتل کون۔

واقعہ یہ ہے کہ سینکڑوں اور ہزاروں دِن اور راتیں شاہجہاں آباد نے ایسی دیکھی ہیں، جب چمنستان اسلام کا پردہ رنگ برنگ کے پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ خلوص و ایثار کے ٹھنڈے اور میٹھے چشمے گھر گھر بہہ رہے تھے اور انسانی سینے ان کرنوں سے جھلملا رہے تھے جن کی چمک چاند سورج کو شرما دے۔ مقصد حیات مکمل ہوتا تھا اُن اذیتوں سے جو بنی نوع انسان کی خاطر اُٹھانی پڑتیں اور یہ وہ کانٹے تھے جو موت کی سیجوں پر پھول بنکر کھلتے اور لباطحیات پر چاند کی طرح دمکتے۔ یہ ہی تفسیر تھی فنا فی اللہ کی اور زندگی نام تھا اِس جذبہ کا، وقت ان مقدس ہستیوں کی جھلک دُنیا کو دکھا کر مٹا چکا اور ان کی تباہی سے دِلّی بھی ایسی اُجڑی کہ پھر پنپنا نصیب نہ ہوا یہ وہ لوگ تھے جو کلمہ توحید پڑھتے پیدا ہوئے اور مرتے دم تک

حبل اللہ کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مسجدیں اور خانقاہیں جو آج ویران پڑی ہیں ان کے دموں سے آباد تھیں اور اسلام کی خالص روشنی ان کھنڈروں سے بلند ہوتی تھی۔ یہ برقی ہنڈے اور گیس کی روشنیاں ہزار بار قربان ہوں، ان مٹی کی دیوں پر جن کا تیل تیل کی بتی اور بتی کی روشنی نعرہ توحید بلند کرتی تھی۔

وہ نورانی صورتیں جن کے سروں پر تاج شرافت دمک رہے تھے اور ایفا عہد کے جواہر ریزے جن کے قدموں پر لوٹتے تھے، میری نگاہوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ میں نے دِلّی کا وہ دور دیکھا ہے کہ اس سرے سے اس سرے تک ہر مُسلمان اسوہ حسنہ کا شیدا ہے۔ مجھے شاہجہاں آباد کا وہ وقت یاد ہے کہ آسمان ان بھولے بھالے مُسلمانوں کی فراخ حوصلگی پر عش عش کر رہا ہے ان پاک دلوں کے دروازے اپنے بھائیوں کے واسطے کھلے ہوئے ہیں اور دور حیات ان کی مہمان نوازی کی قسمیں کھا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دِلّی کا رنگ ظفر کے ساتھ ختم ہوا ۱۸۵۷ء کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے اس نے کایا پلٹ دی بادشاہ اور بادشاہی رنگ کے دیکھنے والے جن کی آنکھیں سرمہ حقیقت سے مزین تھیں، ایک پچیس تیس برس کے اُلٹ پھیر میں اُٹھنے شروع ہوئے۔ دُنیائے اِسلام اٹھارھویں صدی عیسوی

تک اس بہار کا لطف اٹھا چکی ہے۔ بادشاہ نہ تھا مگر اس کے دیکھنے والے موجود تھے۔ صحبت ختم ہو چکی تھی لیکن پروانوں کی خاک کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ طائر خوش الحان اڑ چکا تھا، مگر گل سر گرم فغاں نظر آرہا تھا۔ خزاں کے ظالم ہاتھ پھول کی پنکھڑیاں تک پامال کر چکے تھے۔ مگر فضا اسلامی اس خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔ انیسویں صدی عیسوی اس یادگار کا پیام وداع تھی کہ چمن شاہی کے ساتھ وہ آشیانے بھی اجڑ گئے جن سے کبھی بھولے بسرے کوئی جگر خراش صدا بلند ہو جاتی تھی۔ اکا دکا تنکا کہیں پڑا رہ گیا تو رہ گیا ورنہ کچھ نہ تھا۔

نئی صدی کے ابتدائی آٹھ دس سال جب موت بساط شاہجہاں آباد پر جھاڑو دے رہی تھی ایسے گزرے ہیں کہ کسی نہ کسی محلّہ میں بھولی بھٹکی دو ایک وہ نورانی صورتیں نظر آ جاتی تھیں جن کی سفید ڈاڑھیاں بزم عشرت کی یادگار تھیں۔ دلّی مٹ چکی تھی اور انقلاب نے حسینہ ترقی کے منہ پر ابدی مہر لگا کر وقت کی طاقت کے پورے جوہر دکھا دئے تھے اور اب اس دلہن کی تزئین افشاں کی بجائے خونیں نشان تھے۔ لیکن کبھی کبھی ہوا کا جھونکا عطر عروس کی شمیم سے دماغ کو معطر کرتا ہوا آنکھوں کو شب گذشتہ کے تماشے دکھا دیتا۔ اور ایک آدھ فقرہ ایسا بھی کان میں پڑ جاتا تھا، جس پر آج کل کے دفتر کے دفتر اور کتابوں کی کتابیں قربان ہوں!

مجھے سنہ وغیرہ یاد نہیں۔ ڈاکٹر منشا ف، ولایت سے نئے نئے آئے ہوئے تھے، وہ یورپ میں سولہ سترہ سال رہے۔ اس عرصہ میں دِلّی کچھ سے کچھ ہو گئی تھی، اور ایک دِلّی ہی کیا دُنیا اور دُنیا کیسی زمین و آسمان ہی بدل گئے تھے۔ شام کے وقت ایک روز میرے پاس بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے کہنے لگے۔

"دِلّی کی تو بالکل ہی کایا پلٹ گئی وہ لوگ ہی نہ رہے اور شہر بھی ان لوگوں کے ساتھ ختم ہوا۔ پرسوں شام کو کوچہ قابل عطار سے باہر نکلا تھا بازار کا رنگ دیکھکر سناٹا آگیا۔ باغ کے پاس کبابیوں کی قطار، باغ دیوار کے قریب مونیا کی آواز، شربت کی دُکانیں، سودے والوں کی چیخ پکار سب اُجڑ گئی۔ راجہ کے بازار میں اُلّو بول رہا تھا۔ پہاڑ گنج میں گدھے کے ہل پھرے ہوئے تھے۔ ببّر کا تکیہ، پیر غیب جس کو دیکھتا ہوں ڈھنڈھار وہ چہل پہل کہاں گئی۔ اس گرمی میں راج گھاٹ پر رات دن میلہ سا لگا رہتا تھا۔ چھ بجے سے چراغ جل جاتے تھے، کچھ ایسی ہوا بدلی کہ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ خلیفہ تفضّل، آغا فخر و سُنتا ہوں دونوں بھائی مر گئے۔ یہ دِلّی کے چاند سورج تھے۔ پہلوانی ان کے دم سے زندہ تھی۔ گھر گھر اکھاڑے تھے۔ جدھر نظر ڈالو چوڑے سینے، تنے ہوئے ڈنڑ، بنے ہوئے بدن، سُرخ و سفید گلّے، اب جس کو دیکھتا ہوں ہلدی کھنڈی ہوئی۔ زردی چھائی ہوئی۔ پچکے ہوئے چہرے۔ جُھکی ہوئی گردنیں، میں تو کہتا ہوں یہ وہ دِلّی ہی نہیں۔ جس سے ملا روتا بسورتا

مٹی ہوئی اُمنگیں، بجھا ہوا دل، زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

آج اِن باتوں کو پندرہ برس سے زیادہ ہوگئے۔ مُسافر کے ساتھ اس کا نقشہ بھی مٹ چکا اور مکانوں کے ساتھ مکین بھی اُجڑ گئے۔ آنکھیں اس منظر کو بھی رو چکیں جو دِلّی کو اِس طرح رو رہا تھا۔

میں نے دِلّی کا وہ وقت جب قلعہ معلّٰی میں ہر سمت اطمینان کی ہوائیں چل رہی تھیں اور شہر میں خلوص کی نہریں بہہ رہی تھیں نہیں دیکھا۔ مگر میں نے ان بزرگوں کے قدم چومے ہیں جن کے دامن دورِ سابق کے انعام سے مالا مال تھے اور جن کی آنکھیں دِلّی کا آخری سنگھار دیکھ چکی تھیں۔ یہ متبرک صورتیں میرے سامنے خاک میں ملی ہیں۔ اور ان کی خاک بھی میری آنکھ کے سامنے فنا ہوئی ہے۔ میں نئی دِلّی کو دیکھ کر کیا خوش ہوں۔ اس کی بُنیادیں اُن مُردوں کی خاک اُڑا کر زندہ ہوئی ہیں۔ جن کی خواب گاہ میں پھول بھی ادب سے داخل ہوتے تھے۔

دِلّی کی تباہی واقعہ یہ ہے شروع ہوتی ہے۔ غدر کے واقعہ سے۔ انبارِ مصائب اگر بہادر شاہ کو پہنچنے دیتے تو دِلّی پنپتی اور ضرور پنپتی۔ مگر اس غریب پر تو ایسی پڑی کہ خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ مصیبتوں کے شیر زندگی کے پنجروں میں مقید تھے۔ جو ہر کروٹ اور ہر پہلو جھنجوڑ رہے تھے۔ دُنیا کی کوئی مصیبت اور زندگی کی کوئی اذیّت ایسی نہ تھی جو اس پر نہ آئی ہو۔ پتھر کا دل اور فولاد کا

دماغ بھی ہوتا تو بتاشے کی طرح بیٹھ جاتا اور پرخچے اُڑ جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا دل صحیح تھا نہ دماغ۔ زندگی کے جو دن باقی تھے وہ پورے کر رہا تھا۔ رہنا تھا پاپڑ بیلنے کو اور مرنا تھا سات سمندر پار اُس زمین پر جہاں کوئی حلق میں پانی ٹپکانے والا بھی نصیب نہ ہو۔

یہ خیال کہ قبل از غدر بادشاہ کی خانگی زندگی تکالیف سے پاک تھی درست نہیں۔ وہ نمک حرام جو بہ ظاہر پروانہ تھے یقیناً سوہانِ روح تھے اور بہادر شاہ کے زخم پر یہ ایسے نشتر تھے جنہوں نے زندگی کا کوئی لمحہ بغیر کچوکوں کے نہ چھوڑا۔ اس پر تازیانہ دوسری مصیبتیں تھیں۔ زندہ بچے، برابر کے بازو، قبروں میں پہنچے۔ قدیم نمک حلال جو جان چھڑکنے کے مدعی تھے ایسے نمک حرام ہوئے کہ کھلم کھلّا اور منہ در منہ دشمنی کی، مختصر یہ ہے کہ آلام کی بوچھاڑ ہر سمت سے نازل ہو رہی تھی۔ فخر الملک کے پھول ہو رہے تھے۔ آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں کہ انخلاء قلعہ کی صدا کان میں پہونچی۔ ابھی یہ گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ لقب شاہی کے چھن جانے پر گفتگو شروع ہوئی، افسوس یہ ہے کہ ان چیزوں کی کوئی اصل نہ ہوتی تھی۔ صرف یار لوگوں کی دل لگی یہ ہی تھی کہ بادشاہ کو چین نصیب نہ ہو۔ جو خیر خواہ بنے ہوئے تھے وہ خشک منہ بنا کر آ بیٹھتے اور انتہائی

رنج و صدمہ کا اظہار کرنے کے بعد ایک من گھڑت فسانہ سُنا دیتے تھے۔

یہ سیاسی معاملات ہمارے مضمون سے علیحدہ چیزیں ہیں۔ ہمارے سامنے بہادر شاہ اور فطرت انسانی ہے جس کو سامنے رکھ کر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر مصاحبین کی طرف سے بادشاہ کو اطمینان کامل ہوتا اور وہ بدبخت اس کو اپنا آلۂ کار بناتے تو یقیناً زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔

بادشاہ کے ان زخموں کی آہیں ایسی نہ تھیں جو صرف اس کے سینوں سے نکل کر ختم ہو جاتیں۔ اس انقلاب پر بھی کہ دسترخوان شاہی کے وہ مہمان جنہوں نے عمر بھر روٹیاں توڑیں، ہوا بگڑتے ہی فرنٹ ہو گئے تھے۔ ایسے بندگانِ خدا بھی موجود تھے جو بادشاہ کے ایک آنسو پر چار آنسو گراتے۔ اور اس کی ہر آہ کا جگر خراش نالوں سے استقبال کرتے مگر وقت کی طاقت زبردست تھی۔ یہ وفادار محض اس جرم میں کہ حق نمک ادا کرتے تھے۔ سخت ذلیل و خوار ہوتے۔

تندرست بہادر شاہ اس وقت سو بیماروں کا ایک بیمار تھا۔ کمر جُھک چلی تھی۔ ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ عقل زائل ہو رہی تھی۔ چند نمک حراموں کا مجمع جو اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا برائے نام اس بادشاہت کا مالک تھا جس کا ہاتھ نہ صرف بادشاہی مہر اور قلمدان پر تھا۔ بلکہ بادشاہی دماغ بھی اُن ہی کے قبضہ میں تھا۔ جو چاہتے

بادشاہ کے نام سے کرتے اور جو پسند کرتے اس کی طرف سے کہتے۔

بادشاہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ ہر روز پہلے سے بدتر ہے۔ زندگی کے باقی چند لمحے ذلت و خواری سے لبریز ہیں۔ موت سر پر دکھائی دے رہی تھی۔ اِس لئے اب اس کی تمام اُمیدیں اِس قبر سے وابستہ تھیں جو اپنے واسطے مہرولی یعنی قطب صاحب میں بنا رکھی تھی۔ اکثر وہاں جاتا اور قبر پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا۔

زینت محل نے جو بادشاہ کی آخری اور نہایت عزیز بیوی تھی۔ اور جِس کا بچّہ جواں بخت اب سیانا ہوتا چلا تھا۔ بیٹھے بٹھاتے بادشاہ کو اور غلجان میں ڈالا۔ اس کو اپنے بچّہ کی ولی عہدی کا خبط شروع ہوا۔ نمک حرام وقت کی تاک میں تھے۔ ہاں میں ہاں ملا کر بادشاہ کو آمادہ کیا۔ اور شاہی خیال حکّام تک پُہنچا کر دوسرے شاہزادوں کو بھڑکا دیا۔ یہ فلسفۂ حیات کا ایک مسئلہ ہے کہ ناکامیوں اور مایوسیوں کے بعد بھی دماغ اُمید کے دروازوں کو کھٹکھٹا تا رہتا ہے۔ اور نئی توقعات عجیب عجیب لباس میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اور بستر موت پر بھی صحت کی حسین دیوی اپنے حسن و جمال کے کرشمے دکھاتی رہتی ہے۔ بھادر شاہ زندگی کے ان تمام مصائب کا شکار ہو چکا تھا جو ہاتھی کو بھی ڈھا دیتے۔ لیکن اس کی سخت جانی تعجب انگیز تھی۔ کہ کسی طرح دم نہ نکلتا تھا۔ جواں بخت کی ولی عہدی نے جو شاید زندگی کی آخری مسرت ہوتی۔ قلب حزیں کی گری ہوئی دیوار میں ایک اڑ واڑ لگائی سوکھے

دھانوں میں پانی پڑا اور دل کا وہ چمن جس میں راحت و عشرت کے دروازے قطعاً مقفّل ہو چکے تھے۔ پھر سراپا اُجڑے ہوئے پودوں اور مُرجھائے ہوئے پھولوں پر ایک دفعہ اور بُلبل چہکنے لگی۔

بدنصیب نے اپنے ہاتھ سے کاغذات تیار کیے۔ شہزادوں کے دستخط ہوئے، امرا کی گواہیاں لیں، اور اپنی تجویز و خواہش کا اظہار کر دیا۔ مگر وقت نے اس کی بربادی کی پوری قسم کھالی تھی۔ ھما ذا فرہش (قوباش) خاص خاص شرائط پر ولی عہد منظور ہو گیا۔

انقطاع اُمید کے ساتھ اس فیصلہ نے بادشاہ کی رہی سہی کمر توڑ دی۔ زینت محل جس کی صورت مردے کو جلا رہی تھی لال کنویں پر رہنے لگی۔ اس کا کمرہ اب بھی زینت محل کے نام سے مشہور ہے اور پٹیالہ کی ملکیت ہے۔ اس کی سواری روزانہ قلعہ معلّٰے سے آتی اور جاتی۔ اس کے ساتھ چونکہ نقّارہ بجتا تھا۔ اس لئے اس کا نام ڈنکہ بیگم ہو گیا۔ بادشاہ کا قریب قریب تمام وقت خاموشی میں گزرتا۔ بچّوں کے جو داغ دل پر موجود تھے اُن ہی کو کلیجہ سے لگائے بیٹھا رہتا۔ اور وقت کے ہاتھوں جو نت نئے ستم ٹوٹ رہے تھے ان کو سوچتا رہا۔ ھرنہ ابلا فی مرحوم فرماتے تھے کہ ایک رات کو میں بھی صحبت شاہی میں حاضر تھا۔ عشا کے بعد یہ مجلس شروع ہوئی۔ بیچ میں بادشاہ سلامت تصویر کی طرح گم سُم بیٹھے تھے۔ جو آتا تھا مجرا کر کے خاموش بیٹھ جاتا تھا۔ کسی نے اگر کوئی بات شروع کی تو جواب مِل گیا۔ اور پھر خاموشی

طاری ہوگئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی مگر اس مجلس خموشاں میں جس کو سانپ سونگھ گیا تھا کوئی تغیر نہ ہوا۔ اور لوگ باری باری اُٹھنے شروع ہوئے۔ میں بھی اپنے چچا کے ساتھ اُٹھا اور بارہ دری میں آیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ چچا صاحب نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر آکا بھائی جان سے فرمایا " وہ دیکھو حضور تن تنہا پھر رہے ہیں" بادشاہ سلامت اس وقت اکیلے تھے۔ رات چاندنی تھی۔ خاموش سایہ کے سوا کوئی ساتھ نہ تھا۔ خراماں خراماں روشوں پر ٹہل رہے تھے۔ مگر صورت قلبِ مضطرب کی کیفیت بتا رہی تھی۔ ہمارے تعجب کی کوئی حد نہ رہی۔ جب ہم نے دیکھا کہ حضور چلتے چلتے ایک درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ نگاہ چاند پر تھی۔ اور بعض دفعہ چہرے اور ہاتھوں سے گو خفیف طور پر سہی مگر ایسی حرکات ظاہر ہو رہی تھیں جو دیباچہ جنون سمجھی جا سکتی تھیں۔ میرا شباب تھا۔ میں سو گیا۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ پھر کیا ہوا۔ اور حضور کس وقت خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔

اِس موقع پر اگر زینت محل پڑھی لکھی عورت یا بیوی ہونے کی حیثیت سے کچھ بھی احکام اسلام سے باخبر ہوتی تو ممکن تھا۔ بادشاہ کی زندگی کا یہ حصہ اس قدر تلخ نہ ہوتا۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ شہزادیوں میں اِس وقت تعلیم کا چرچا ہی نہ تھا۔ خجستہ اختر، محل ہی بیگم، فاطمہ سلطان خاصی تعلیم یافتہ بیویاں تھیں۔ فاطمہ سلطان

تو غدر کے بعد بھی مدتوں زنانہ مشن ہیں بڑی اُستانی رہی۔ اور تلاش کیا جائے تو شہر ہیں اب بھی اُس کی دو چار شاگردیں زندہ ہوں گی۔ لیکن بادشاہ کی بدقسمتی سے جہاں اور سامان مصائب پیدا ہو رہے تھے وہاں زینت محل کی جہالت بھی تھی۔ اور اس وقت بھی کہ شوہر کے اس بارچہ حیات کا ہر کچوِ نسٹر ابجائے خود ایک مجسم اذیت تھی۔ جواں بخت کی ناکامی کے کچوکے دیتی رہتی۔ زینت محل کو تو بانش کی ولی عہدی اور جواں بخت کی ناکامی سے جس قدر صدمہ ہوا وہ سب صحیح۔ لیکن اس کی خواہش اب صرف یہ تھی کہ وہ اپنے صدمہ ہیں تنہا نہ رہے بلکہ بادشاہ کو بھی شریک رکھے۔ زینت محل کی یہ سعی بدنیتی نہ سہی اور لاکھ اس کا عدم احساس سہی مگر یہ وہ جہالت تھی جس نے بدبخت بھادر شاہ کو کہیں کا نہ رکھا۔ اور جو تھوڑا بہت چین و راحت جواں بخت کو دیکھ کر فطرتاً میسر آتا وہ اس کی بدولت اذیت سے، اور وہ اطمینان و مسرت جو زینت محل کے پاس کبھی کبھار نصیب ہو جاتا اس کی وجہ سے خلش و کوفت سے بدل گئے۔ زینت محل اب زیادہ تر اپنے کمرہ ہیں رہتی۔ ایک دفعہ بادشاہ بھی متواتر کئی روز مقیم رہے۔ شہر والوں نے اس کو پسند نہ کیا۔ اور وہ اگر بادشاہ کو صحیح الدماغ سمجھتے تو اس کو گوارا نہ کرتے۔ اور ایک دن بھی وہاں نہ ٹھہرنے دیتے۔ مگر اب ان کو بادشاہ کی صحت ہی کے لالے تھے اس لئے دخل نہ دیا۔ اور اس کو گوارا کیا۔ بھادر شاہ کی صحت

اب بگڑ گئی تھی۔ درد گردہ کا دورہ وقتاً فوقتاً ہوتا۔ نزلہ کی شکایت اکثر رہتی۔ ڈاڑھوں اور دانتوں میں ہمیشہ درد رہتا۔ غرض سو بیماریوں کی بیماری ایک بڑھاپا تھا۔

پانچویں نوبت

شاہجہاں آباد سے بادشاہ کی وداع

جشنِ شاہی کے جمگھٹے اور نوبتوں کے جشن ختم ہوئے راتیں ہوا کی طرح گزریں۔ اور دن بات کر کے نکل گئے۔ بہادر شاہ کی تخت نشینی کہنے کو کل کی بات ہے۔ لیکن آج جگ بیت گئے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ جلوس جن کی صدائیں آسمان میں گونج رہی ہیں۔ زندہ بادشاہ کو موت کا مزہ چکھا دیں گے۔ زمین کا ہر ذرہ جان کا دشمن اور دنیا کا ہر متنفس خون کا پیاسا ہوگا۔ آفات و ابتلا کی بجلیاں اس خرمن عیش پر کوند کوند کر گریں گی۔ اور یہ نادان انسان جس کے قدموں سے اس وقت جہاں آباد آنکھیں رگڑ رہا ہے۔ مصائب حیات کا ایسا نمونہ ہوگا کہ دنیا اس کو دیکھ کر بھاگے گی۔

بہادر شاہ کی موت کو نہ معلوم کون سی موت کھا گئی تھی کہ دنیا مر رہی تھی لیکن اس کو موت نہ آتی تھی۔ شاہی مٹ چکی، حکومت ختم ہوئی، دولت کو آگ لگ گئی۔ عیش رخصت ہوا۔ مصائب کا توڑ۔ آفات کا نچوڑ کس کس کا رونا رویا جائے۔ جوان جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے خاک میں چلے گئے۔ کیسے کیسے موٹے تازے دوست اور خیر خواہ قبروں میں جا پہونچے۔ لیکن زندہ رہا تو وہی کم بخت مصیبتیں جھیلنے اور آفتیں اٹھانے کو۔ اس حال میں کہ دیوانوں سے بدتر اور اس رنگ میں کہ فقیروں سے ابتر۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سنگ دل لڑکے کی طرح جو

پرندے کو پکڑ کر کبھی اس کا پر نوچتا ہے اور کبھی ٹانگ۔ وقتاً بھی بھادر شاہ کو قسم قسم کی اذیتیں پہونچا کر تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ان تمام مصائب کے بعد جو قلب شاہی پر نازل ہوئیں اور اس عمر میں کہ پیری شروع اور صدہا عیب نمودار ہو چکے تھے اس کا زندہ رہنا ہی تعجب تھا۔ لیکن یہ زندگی زندگی نہ تھی۔ اس زندگی سے موت بدرجہا بہتر تھی۔ فخر الملک، مرزا باقی مرحوم، حضرت مرزا حسین بخش مغفور جیسے ثقہ افراد کا بیان تھا کہ ہوش و حواس موجود تھے مگر بعض دفعہ کچھ ایسی بہکی بہکی باتیں اور غلط حرکتیں ظہور میں آجاتی تھیں کہ تعجب ہوتا تھا۔



بادشاہ جس مصیبت کو جھیلنے کو زندہ تھا اب اس کا آغاز ہوتا ہے۔ ۵۷ء کا موسم گرم شباب پر تھا۔ مئی کا پہلا ہفتہ گذر چکا تھا کہ فوجوں میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے اور آناً فاناً یہ رنگ قریب قریب تمام ہندوستان پر چھا گیا۔ واقعات غدر اس کتاب سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔ مگر نوبتِ آخر کا مضمون اس انقلاب کی جس نے بھادر شاہ کی رہی سہی عقل زائل کر دی ایک ہلکی سی جھلک کا محتاج ہے۔ تاکہ ثابت ہو سکے کہ بادشاہ جس کے خلاف اثبات جرم کیا گیا اثبات عقل ہی سے محروم تھا۔ صلاح و مشورے تو در کنار اس کو اپنی جان ہی کے لالے تھے۔ اس کا سنگین جرم اگر ہو سکتا ہے

نو صرف یہ کہ وہ خود باغیوں کے ہاتھوں کیوں نہ شہید ہو گیا۔ وہ شائد ایسا بھی کر گذرتا اگر اُس کو یقین ہو جاتا کہ بدبخت آنکھوں کو وہ وقت دیکھنا ہے کہ انیس و جلیس ثبوت جُرم کے شاہد ہوں گے اور ان ہی ایمان داروں کا بیان جو آج میری پرستش کر رہے ہیں مجکو بے ایمان بنائے گا اور یہ نمک حرام جو اِس وقت میرا کلمہ پڑھ رہے ہیں مجکو مجرم بنائیں گے اور آسمان سرزمین جہاں آباد کی وہ ساعت دیکھے گا جب میرے اپنے، میرے مُنہ در مُنہ، تُہمتیں تراشیں گے طوفان اُٹھائیں گے اور بُہتان باندھیں گے۔

غدر میں ٹھہ سے شروع ہوا اور راتوں رات باغیوں کی بڑی جماعت جمنا پار کر شہر میں پہنچ قلعہ کے پاس ثمن بُرج کے نیچے آ کھڑی ہوئی۔ اور کہا ہمارا دین دُنیا کا گسیاں بہادر شاہ ہے۔ بادشاہ نے یہ سُنا مگر جواب دینا تو درکنار سامنے تک نہ آیا اور اُسی وقت حکیم احسن اللہ خاں اور شمشیر الدولہ غلام عباس کو بلا کر حکم دیا کہ فوراً کپتان ڈگلس قلعہ دار کو اطلاع دو۔ چنانچہ کپتان ڈگلس نے برآمدہ میں آ کر ان لوگوں سے گفتگو کی اور راج گھاٹ کی طرف یہ سمجھ کر خود بھی جانے کا قصد کیا۔ تو بادشاہ نے روکا اور کہا آپ کا تنہا اور تنہا جانا قرینِ مصلحت نہیں۔ ڈگلس نے قصد ملتوی کیا اور عرض کیا کہ دو نگہبان روانہ فرمائیے کہ دو میمیں شاہی محل میں بھیج دی جائیں، اُسی وقت سائمن فریزر صاحب کمشنر آ گئے اور اُنہوں نے عرض کیا کہ دو توپیں اور توپچی ہمارے

بنگلہ پر بھیج دیجئے۔ چنانچہ فوراً بادشاہ نے احکام صادر فرمائے۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا اُدھر باغیوں نے جو کپتان صاحب کی ہدایت کے موافق راج گھاٹ گئے تھے شہر میں داخل ہو کر قیامت ڈھا دی اور جو انگریز ملا اُسے قتل کر دیا۔ کوٹھیوں میں آگ لگا دی شہر کے اکثر ہندو مسلمان اُن کے ساتھ ہو گئے اور یہ ہجوم قلعہ پر آیا۔ فریزر صاحب نیچے آکر اُن لوگوں کو سمجھا رہے تھے کہ مغل بیگ نے ایسی تلوار ماری کہ گلے اور گدی کے پار ہو گئی۔

قلعہ کے بالائی حصے میں ڈپٹی کمشنر ہچنس صاحب اور کپتان ڈگلس زخمی پڑے تھے۔ شاہ بدبخت کے واسطے یہ کیسا نازک وقت تھا۔ باغیوں کے ساتھ قلعہ کے سپاہی بھی مل گئے اور پناہ گزین انگریزوں پر وار کرنے لگے۔ ہچنس اور ڈگلس کے ساتھ جو میمیں اور مسیں تھیں انہوں نے دفع مصائب کے واسطے نماز شروع کی مگر ختم نہ کرنے پائی تھیں کہ باغی اوپر چڑھ گئے اور ان سب کو تہِ تیغ کر دیا۔ اور خون آلودہ تلواریں لئے قلعہ میں ٹہلنے لگے۔ ان کے کرتوت اور حالات دیکھ کر بہادر شاہ کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس بدنصیب کی وقعت ان سرکشوں کی نگاہ میں کتنی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ دیوان عام سواروں کا اصطبل بنا اور دیوان خاص میں سپاہیوں نے ڈیرے ڈالے جہاں خود بادشاہ کے قدم ادب و احترام سے اُٹھتے تھے وہاں تلنگوں کے کرنیل دھونی رمائے تھے۔

ہم کو شہر کے مفصل حالات سے بحث نہیں۔ وہاں بھی بے گناہ انگریزوں کا قتل عام ہو رہا تھا اور بنگلوں سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل بلند ہو رہے تھے۔

(۲۷ مئی ۱۸۵۷ء کو انسپکٹر جنرل اور ڈنینس کو جو چٹھی میگزین کے متعلق ملی ہے اُس میں بہادر شاہ کا ذکر دو جگہ ہے۔ ہم اُس کو حرف بہ حرف نقل کرتے ہیں۔ یہ گویا مجرم بادشاہ کے جرائم کی ابتدا ہے۔

"بارود میں آگ لگانے کے انتظام ہو ہی رہے تھے کہ قلعہ سے ایک گارد نے آکر کہا بادشاہ نے کہا ہے میگزین حوالے کر دو۔ اسکے بعد تلنگوں کا صوبہ دار جو میگزین پر متعین تھا آیا اور کہنے لگا۔ بادشاہ نے باغیوں کے پاس یہ پیغام بھیجا ہے کہ قلعہ سے زینے آئیں گے تاکہ باغی میگزین کی دیواروں پر چڑھ جائیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد زینے آگئے اور باغی دیواروں پر چڑھ گئے۔"

اا مئی کو جب یہ قیامت بپا ہو رہی تھی۔ شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ بادشاہ باغیوں کی طرف ہے۔ اور یہ لڑائی بادشاہ اور انگریزوں کی ہے۔ قلعہ کے لوگ اسی وجہ سے لڑائی میں شریک ہو گئے۔ شہر والوں میں کچھ یہ سمجھے کہ بادشاہ کی فتح کے بعد پو بارہ ہیں۔ کچھ اس لئے شریک ہوئے کہ لوٹ مار کا بازار گرم ہے لگتے ہاتھ رنگ لیں)۔

یہ حالت دیکھ کر دریا گنج کی کوٹھی میں کچھ انگریز اور اُن کے

بال بچے اس لئے جمع ہوئے کہ وہاں ایک تہ خانہ بھی تھا۔ اُن کے پاس سامان حرب بھی تھا۔ باغیوں کو خبر لگی اور وہ پہنچے۔ دن بھر کوشش کی کہ گرفتار کرلیں لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ مرزا ابوبکر بھی اپنی توپ لے کر آئے۔ لیکن بندوقوں کی گولیوں کے آگے نہ ٹھہرسکے غریب پناہ گزینوں نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا۔ مگر بالآخر گولہ بارود نے جواب دیا اِدھر باغیوں نے یہ پیام بھیجا کہ اگر تم باہر آجاؤ تو ہم سب کو صحیح سلامت بادشاہ تک پہنچادیں گے۔ ان غریبوں کو یہ پیغام غنیمت ہوگیا اور یہ مرد عورتیں، بچے، جو تعداد میں تیئس تھے باہر نکل آئے اور قلعہ پہنچے۔ بادشاہ کا نام فقط آڑ تھا۔ باغی جو چاہتے تھے وہ کرتے تھے۔ بادشاہ ذرا خلاف کرتا تو بوٹیاں کھا جاتے۔ قلعہ کے باورچی خانہ میں اُن کو قید کیا اور کہہ دیا کہ حکم شاہی یہ ہے۔

اگر یہ حقیقت حکم شاہی بھی تھا تو کیا یہ عقل میں آسکتا ہے کہ بادشاہ باغیوں کی مرضی کے خلاف کوئی حکم دیتا اور اس کی تعمیل ہوجاتی تعمیل تو درکنار مخالفت شاید بادشاہ ہی کی جان کو مصیبت میں ڈال دیتی۔ مختصر یہ کہ ان قیدیوں کو خاصہ کے مکان میں بند کر باغی شہر میں گئے اور انگریزوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور چُن چُن کر نکالا۔ بیس پچیس آدمیوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور لائے اور وہیں بند کیا۔ شمس العلماء منشی ذکاء اللہ فرماتے ہیں میں نے اپنی آنکھ سے چاندنی چوک میں یہ جگر خراش سماں دیکھا

کہ ایک جوان میم بچہ کو تو لئے ہیں پلیپٹے کلیجہ سے لگائے اور چھ سات برس کے بچہ کی انگلی پکڑے باغیوں کی حراست میں چاندنی چوک کی پٹری پر جا رہی تھی، کئی جگہ باغیوں نے اس بچہ کی طرف سنگینیں اٹھائیں اور قتل کا قصد کیا۔ ماں کا استقلال قابلِ داد تھا کہ وہ خاموش جا رہی تھی اور اُف نہ کرتی تھی۔ جانتی تھی کہ ہوں کروں گی تو یہیں تینوں کا قتل ہو گا۔ ان کو بھی لے جا کر قلعہ کے اسی قید خانہ میں بند کیا۔

اب ذرا شاہ بدبخت کی کیفیت سنئے۔ غدر ہو چکا، واقعات گذر گئے، مرنے والے اس وقت اور بچنے والے اس کے بعد مرتے گئے اور مر گئے مگر ان کے بیان موجود ہیں اور بتا رہے ہیں کہ بہادر شاہ کے اختیارات کیا تھے اور اس شرارت میں اس کو کتنا دخل تھا۔ قیدیوں کی خبر سنتے ہی شام کو کھانا خود بادشاہ نے اپنے دسترخوان سے ان مظلوموں کو بھیجا۔ اس کا یہ سلوک دیکھ کر تلنگوں کی تیوری پر بل آیا اور سرگوشیاں کرنے لگے۔ صبح کا کھانا پھر بادشاہ نے بھیجا۔ لیکن اب سرکشوں سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ کھانا لے معمولی روٹی دینے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۱ مئی کی صبح کو تیسرے رسالہ کے ترک سواروں نے اور بادشاہ کے خاص بردار سپاہیوں نے اس جماعت کو جس میں پانچ چھ مرد اور باقی عورتیں بچے تھے۔ نقار خانہ کے سامنے حوض پہ بٹھا کر قتل کر دیا۔

شہر میں بہت سے اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جو یہ خبر سُن کر لرز گئے اور کہا کہ عورتوں اور بچّوں کا قتل کسی مذہب میں روا نہیں۔ یہ خون رنگ لائے گا اور قلعہ پر قہر خدا نازل ہوگا۔ لیکن باغیوں کا زور لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ کسی کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ اُن کے خلاف زبان کھول سکے۔

بادشاہ کے جرائم پر تفصیلی بحث ہمارا مقصود نہیں۔ مدّتیں ہوئیں کہ فیصلہ ہوچکا اور کسی ایک شخص یا معمولی شخص نے نہیں کئی ایک نے اور سمجھدار کئی ایک نے کر دیا جو کچھ کرنا تھا۔ ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ ایک تن واحد پر مصائب کے اِس قدر ہجوم کا بھی امکان ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جُرم کے ساتھ ہی ساتھ حقیقت جرم پر بھی غور ہو جائے۔

حکیم احسن اللہ خاں جو بہادر شاہ کے قدیمی نمک خوار کیا جس کا گوشت پوست شاہی نمک سے بنا تھا اپنی شہادت میں بادشاہ کے خلاف فرماتے ہیں کہ ”شاہی ملازموں میں سیدی نصیب خواں بسنت خواجہ سرا اور شہزادوں میں مرزا ابوبکر اور مرزا اقصر سلطان اس میں شریک تھے۔ میں نے دو روز بادشاہ کو احکام قتل سے روکا مگر بالآخر بادشاہ نے حکم دے دیا وہ اگر چاہتا اور یہ کہہ دیتا کہ پہلے میرے بیوی بچّوں کو قتل کر دو تو باغی باز آجاتے۔“

صاحب تاریخ ہندوستان کی رائے ہے کہ احسن اللہ خاں

کا بیان قطعی لغو اور لچر ہے۔ بادشاہ کے اختیار ہی میں نہ تھا کہ وہ ان باغیوں کی رائے کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکتا۔ وہ اس کے ثبوت میں لکھتے ہیں کہ چنی لال مخبر کا یہ بیان موجود ہے کہ جب مرزا منجھلے نے کہا کہ عورتوں اور بچوں کا قتل اسلام میں جائز نہیں تو تلنگے اُن کے مارنے پر آمادہ ہوگئے اور منجھلے نے بھاگ کر جان بچائی۔

اس افراتفری میں بھی شہر کے کمینے اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے ان بے فکروں کو کیا خبر تھی کہ اُن کے ان کارناموں کا کیا حشر ہوگا۔ ایک گپ یہ اڑی کہ سلیم گڑھ میں بادشاہ کے تمام بزرگوں اور سلطنتوں کا خزانہ دفن ہے جس پر طلاق لکھی ہوئی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ بادشاہ مذہب کی لڑائی ہو تو کھول سکتا ہے۔ چنانچہ بہادر شاہ نے اس کو کھول لیا۔ سوار کو بیس روپے اور پیدل کو دس روپے مہینہ ملے گا۔ جو چاہے نوکر ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے آدمی جوان بھی اور پنشن خوار بھی آکر جمع ہوگئے اور باغیوں سے مل گئے۔ اس آگ کے شعلے ایسے بھڑکے کہ قریب قریب تمام ہندوستان کو جھلس دیا۔ دِلی تو انگریزوں کا قتل عام ہو ہی رہا تھا کانپور وغیرہ میں اس سے زیادہ ظلم ڈھائے گئے اور جس کو جہاں موقع ملا وہاں کا نواب راجہ بادشاہ حاکم بن بیٹھا۔ کہیں نانا راؤ کی حکومت ہوئی۔ کہیں تلنگوں کی۔ رہے بادشاہ ان کی کیفیت کا اندازہ تاریخ ہند کے ان الفاظ سے ہوگا کہ

کہ بادشاہ عیدگاہ میں جاکر نماز پڑھتا تھا اور اونٹ کی قربانی اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ آج اس کی ہمت نہ پڑی ورنہ خود اس کی قربانی ہو جاتی۔ تلنگوں نے اس موقعہ پر مسلمانوں کو گائے کی قربانی نہ کرنے دی اور کہا آج صرف انگریزوں کی قربانی ہونی چاہیئے۔

اس سے زیادہ دردانگیز وقت ہندوستان کی آنکھوں نے اس سے پہلے کم دیکھا ہوگا۔ زبردست کمزور کو کھا رہا تھا۔ قانون اور انصاف غارت ہو چکے تھے۔ ظلم و ستم کا دور دورہ تھا۔ شرافت و انسانیت کی جگہ طاقت کام کر رہی تھی۔ رحم و ہمدردی کا نام فنا ہو چکا تھا اور تمام ملک میں جبر و تعدی کے ڈنکے بج رہے تھے۔

تقریباً ساڑھے چار مہینے تک یہ آگ لگی رہی۔ بادشاہ پتھر کی ایک مورت کی طرح قلعہ میں بٹھا دیا گیا جس کو ضرورت ہوئی اور جب ضرورت ہوئی اور جیسی ضرورت ہوئی اس آٹے کی آپا سے دستخط کروا لئے۔ پہلا حکم جو بادشاہ کی خود مختار بادشاہی کا تھا وہ یہ تھا کہ آئندہ سے گائے ذبح نہ ہوگی۔ یہ حکم ہی بتا رہا ہے کہ بہادر شاہ کی بادشاہی کیا وقعت رکھتی تھی۔ گائے قصاب اگر بھولے بھٹکے شہر میں کوئی دکھائی بھی دے گیا تو تلنگوں نے قتل کر دیا۔ دوسرا حکم یہ تھا کہ "کوڑا کرکٹ جو پہلے بیلوں پر لادا جاتا تھا آئندہ گدھوں پر لدے"۔ یہ حکم بھی بادشاہ کے اختیارات کا پتہ دے رہا ہے۔

بہادر شاہ کے اعلانات شاہی یا تخت نشینی کی داستان یوں ہے کہ جب دیوان خاص کے چپہ چپہ پر تلنگے چھا گئے تو انہوں نے بادشاہ

کو طلب کیا اور کرسی پر بٹھا کر کہا "ہم اپنا انتظام خود کرلیں گے۔ آپ صرف ہمارے سر پر ہاتھ رکھیے" یہ کہکر بادشاہ کے قدموں پر سر رکھدئے۔ اور نذریں پیش کیں۔ بادشاہ نے اُن کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ دن بھر بدستور قتل و غارت میں مصروف رہے۔ جب رات ہوئی تو قلعہ میں اکیس توپیں سر ہوئیں۔

تاریخ ہندوستان کا مؤلف اِن دونوں جرائم کے سلسلہ میں قول فیصل کے وقت خود متحیر ہے اور کہتا ہے جہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ نے باغیوں کی سرپرستی قبول فرمائی وہاں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس خوف سے اُن کی التجا منظور کی کہ سر پر ہاتھ نہیں رکھتا تو اپنا سر دھڑ پر نہیں رہتا"۔ اسی طرح توپوں کے معاملہ میں بھی وہ لکھتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ توپیں اعلانِ شاہی کی تھیں یا دن بھر کی اس فتح کی جو اُن کو انگریزوں کے قتل و غارت میں حاصل ہوئیں۔

اا مئی ۱۸۵۷ء یعنی جس روز سے انگریزی حکومت اٹھی۔ کوئی گناہ، کوئی ظلم، کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو شہر میں نہ ہوئی ہو۔ بازار قریب قریب بند تھے۔ دکانیں اور گھر لٹتے تھے۔ قتل کی وارداتیں شب و روز ہورہی تھیں۔ شہر والوں نے باغیوں کے بھی ہوش اُڑا دئے اور انہوں نے شہر کے مہاجنوں اور آڑھتی کی آپا میاں مہیئں بادشاہ کو باہر نکالا کہ شاید دباؤ چل جائے اور بادشاہ کے کہنے سے دکانیں کھل جائیں۔ سواری کا جلوس نکلا۔ مگر اس طرح کہ وردیاں پھٹی ہوئی، جوتیاں ٹوٹی ہوئی۔ بادشاہ

کے ہاتھی کے آگے تلنگے دھوتیاں باندھے ہوئے، اور جے پکارتے ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ دکانیں کھلیں لیکن کس طرح؟ اس طرح کہ سواری آگے بڑھی اور دکانیں بند۔ غرض تمام شہر میں تلنگوں کی حکومت اور ان ہی کا دور دورہ تھا۔ چوڑی والوں کے بارود خانہ میں آگ لگی۔ اس کی تہمت حکیم احسن اللہ خاں پر رکھ اُن کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ گھر لوٹا، آگ لگائی، اور وہ ہاتھ آجاتے تو اُن کو بھی مار ڈالتے۔ باغیوں تک جن کی رسائی تھی اُنکے پوبارہ تھے جس کو چاہا لٹوا دیا پٹوا دیا اور مروا دیا۔ ملک کے ہر حصہ سے عرضیاں آتی تھیں کہ آج ہم نے اتنے انگریز مارے اور اس طرح شہر پر قبضہ کیا۔ اس کا جواب بادشاہ کی طرف سے جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض درخواستوں پر خود بادشاہ کے اپنے قلم کے بھی احکام تھے۔ مگر بادشاہ ہماری رائے میں تو ایک کٹھ پتلی تھا اور باغی جس بل پر چاہتے تھے نچاتے تھے۔ قدرت اللہ خاں رسالدار سو سوار لے کر اودھ کی تمام سپاہ کی طرف سے ایک عرضی لایا اور بادشاہ کی خدمت میں بادشاہ کے نئے سکّہ کی اشرفیاں پیش کیں جس پر یہ منقش تھا۔

بزر اسکہ نصرت طراز سراج الدین بہادر شاہ غازی

دِن بھر یہی تانتا لگا رہتا تھا۔ اور باغی اسی آڑ میں مزے اُڑا رہے تھے شہر کے بدمعاشوں نے دو دفعہ جہاد کا جھنڈا گاڑا۔ لیکن بادشاہ نے اُکھڑوا دیا۔ ایک عرضی کے جواب میں جس کا مقصد یہ تھا کہ ہم چھ ہزار جہادی دہلی آرہے ہیں۔ بادشاہ کا یہ حکم صادر ہوا کہ یہاں کی سات ہزار

فوج تو انگریزوں پر غالب نہ آسکی تم آکر کیا کرو گے۔

۹ ر جولائی کے واقعات میں درج ہے کہ چند گوروں کا سر کاٹ کر تلنگے بادشاہ کے سامنے لائے تو وہ بہت خوش ہوا اور انعام دیا۔ مگر اِس کے ساتھ ہی ۲ ر جولائی کو جو احکام بادشاہ کی طرف سے نافذ ہوئے تھے اُن میں بادشاہ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ میرے احکام فضول و عبث ہیں۔ ان پر تعمیل تو درکنار کوئی سنتا تک نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ بادشاہ کا دم تو پہلی جون ہی کو سپاہ کے ہاتھ سے نکلنے لگا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے اور پوتوں کو جو باغیوں کے ساتھ شریک تھے بُلا کر کہا کہ تم سرکشوں کے ساتھ اور ان سے ہمدردی کر رہے ہو۔ یاد رکھنا کہ انگریز ایک روز ہندوستان کے مالک ہوں گے اور میں بقیہ عمر کفن پہن کر بسر کر دوں گا۔

مئی کے مہینے نے تو یہ ستم ڈھایا تھا کہ شہر میں گھر گھر اور کوچے کوچے تلاشیاں ہو رہی تھیں کہ کوئی انگریز نہ چھپا ہوا ہو۔ خوشحال دن دہاڑے لُٹ رہے تھے اور غریب خواہ مخواہ کی روندن میں، ستمبر اپنے ساتھ جو قیامت لایا اُس کے خیال سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ گنہ گار اور باغی موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ اور ان سزاؤں نے جو سچی تھیں تمام شہر میں سناٹا کر دیا۔ آباد اور گنجان محلوں میں وسیع اور مرتفع بازاروں میں کُتے لوٹ رہے تھے۔ سڑکیں اور گلیاں لاشوں سے پٹی

پڑی تھیں۔ تلنگے اپنا زور دکھا چکے۔ اب انگریزی جلال کے دور دورے تھے۔ دن اور رات اندھیرے اور اجالے پھانسیاں اور گولیاں تھیں۔ اس مصیبت کی ابتدا پہاڑی کے گولوں سے ہوئی۔ تلنگوں کے زخمی ابھی پوری طرح کام بھی نہ آئے تھے۔ سسک ہی رہے تھے کہ انگریزی نشتروں کے کچوکے شروع ہو گئے۔

۱۴ ستمبر کو انگریز شہر میں داخل ہوئے، اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ جو جہاں ملا پکڑا اور پہنچا پا۔ کوئی بندوق کی نظر ہوا کوئی پھانسی کی بھینٹ چڑھا۔ گھروں کی بیٹھنے والیاں جو مردوں کی ایک گھرکی میں فنا ہو جاتیں، گورے اور کالے سپاہیوں کو دندناتے آتے مارتے اور لوٹتے دیکھتیں اور سہم کر کونوں میں گھس جاتیں۔ مردوں کے قتل و موت کی خبر اُن کے کانوں میں آتی مگر اُف نہ کر سکتیں۔ کچھ بیچارے بھرا گھر چھوڑ چھاڑ عورتوں بچوں کو ساتھ لے رات کے سُنسان وقت میں نکلتے کہ اندھیرے گھپ میں بھاگ نکلیں۔ مگر دروازہ پر انگریزی فوج ان کا قلع قمع کرتی۔ اور اگر کچھ خوش نصیب بچ بچا کر نکل جاتے اور آس پاس کے گاؤں میں جا پہنچتے تو گوجر اور میو کُتے کی موت مارتے۔ تاریخ ہندوستان کے مؤلف کا بیان ہے کہ کرنل برن نے جو شریف النفس انسان تھے یہ حکم دیا کہ گشتی سپاہ رعیت کو پکڑ کر اُن کے پاس لائے۔ یہ سپاہ دن بھر انکے حکم کی تعمیل کرتی۔ مرد، عورت، بچے جو نظر آتا اس کو گرفتار کرتے اور لاتے۔ یہ منظر بھی بہت ہی دردانگیز تھا۔ بڑی بڑی پردہ نشین بیویاں۔ جن کے گھروں میں بارہ برس کا بچہ

نہ جا سکتا۔ اوڑھنے بچھونے سر پر رکھے بچوں کو گود میں لئے آگے آگے اُن کے مرد پیچھے پیچھے وہ سپاہیوں کی حراست میں روتی بلبلاتی چلی جاتی تھیں۔ کرنل صاحب کے سامنے اُن کی تلاشی ہوتی۔ اور پیسہ زیور کپڑا لے لیا جاتا۔ اور اسباب دے دلیس نکالا ملتا۔

رات کے سنّاٹے میں جب ماما کی ماری ماؤں کا نالہ بلند ہوتا جن کے پھول سے لال اُن کی گودیں ہمیشہ کو خالی کر گئے۔ اور اُن بدبخت دلہنوں کا بین ہوتا جن کی مہندی تک ابھی میلی نہیں ہوئی اور سہاگ اُجڑ گیا۔ تو شاہجہاں آباد کے آسمان و زمین اُن کے ساتھ روتے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جہان آباد کے بعض خاندان اس آن بان کے لوگ تھے کہ کنواری بچی کو باپ کی دہلیز لانگنی حرام تھی، کھوٹ لا نکلنا تھا مرکز یا پالکی نکلتی تھی دلہن بنکر۔ غدر نے ان کی یہ عفتی پٹیاں کی کہ نامحرموں کے سامنے کھڑی ہوں۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو اور بدن تھر تھر کانپ رہا ہو۔ باپ بھائی آنکھوں کے سامنے قتل ہوں۔ اور بیرقعے پردے والیاں بے وارث بن کر جنگل بیابانوں میں راتیں گذاریں۔

میں نے اپنی صدائے جگر خراش سے چالیس سال تک مسلمانوں کو پریشان رکھا اور اُن کے سامنے ایسی مرنے والیوں کا مرثیہ پڑھتا رہا جن کا آنچل تک غیر مرد نے نہ دیکھا۔ یہ عصمت مآب خواتین کا وہ گروہ تھا جن کے دوپٹوں پر فرشتے نثار ہوتے تھے۔ انھیں ماں کی گود سے ہی وہ

تربیت ملتی تھی جس پر آج ہم جس قدر فخر کریں کم ہے۔ اس وقت کہ وہ دور ختم ہو چکا اور اب دختران اسلام نئے نئے روپ میں پردہ زندگی پر جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ اس گئی گذری حالت اور مٹے مٹائے رنگ میں بھی مرنے والیوں کا ذکر کلیجہ توڑ دے گا۔

جب ان بدبختوں کے سر سے والی وارث اُٹھ چکے اور اُن کو پورا یقین ہو گیا کہ ان کی عصمت کے محافظ پھانسیوں پر لٹک گئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ زندگی جن دموں سے متعلق تھی وہ رخصت ہوئے۔ جو صورتیں عمر کی شریک تھیں ختم ہوئیں۔ اور جن آنکھوں نے پیمان وفا کیا تھا وہ بند ہو گئیں تو اب جینا بے سود ہے۔ یہ گنتی کی دس بیس عورتیں نہ تھیں۔ شاہجہاں آباد کا ہر محلہ عصمت کی ان دیبیوں اور قدرت کے ان خزانوں سے پٹا پڑا تھا یہ وہ وقت ہے کہ دلی کی بعض کنواری اور رانڈ عورتیں فوجی افسروں سے نکاح کر کے خوف و حراس کو آگ لگا چکی تھی اور اطمینان سے زندگی بسر کر رہی تھیں اور دوسروں کے واسطے نمونہ ہو سکتی تھیں۔ لیکن دلّی اُن بہو بیٹیوں سے خالی نہ تھی۔ جن پر شہر اب بھی فخر کرتا ہے۔ یہ پاک دامن اللہ والیاں آدھی رات کے وقت جب سڑکوں اور گلیوں میں سنّاٹا ہوتا نماز پڑھ کر خداوند کریم کے حضور میں سر بسجود ہوتیں۔ دودھ پیتے بچّوں کو باندھتیں اور کنوؤں میں گر کر اپنی عصمت پر قربان ہو جاتیں۔ شہر کے تمام کنوئیں عفت کی ان دیویوں سے کھچا کھچ بھر گئے اور کوئی کنواں ایسا نہ بچا جو ان لاشوں سے لبریز نہ ہو۔ اندھے کنوؤں میں منڈیر تک عورتیں

ہوتی تھیں۔ ان پر جب اور عورتیں گرتیں تو ڈوب سکتیں نہ مر سکتیں۔ مصیبت جھیلنے اور پاپڑ بیلنے کو زندہ سلامت رہتیں۔ جن کے پاس مرنے کے اور اسباب موجود ہوتے۔ یعنی کچھ سنکھیا۔ افیون وغیرہ وہ گھر ہی میں کھا کر مر رہیں۔

دِلّی ایک آدھ دفعہ نہیں بارہا ایسی اُجڑی ہے کہ اس کی داستان سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مگر ۵۷ء کی مصیبت کے ساتھ قدم قدم پر ایسی آفتوں کا طومار تھا جس نے زندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا دُنیا اِس قسم کے انقلاب کا تماشہ بارہا دیکھ چکی ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ کیفیت کسی نے کم دیکھی ہو گی کہ شہر قبرستان بنا ہوا تھا۔ در و دیوار تک مُردوں سے پٹے پڑے تھے۔

رچرڈ بونس صاحب لکھتے ہیں "ہم علی الصباح لاہوری دروازہ سے چاندنی چوک کی طرف چلے۔ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں نے صبح کی خاموشی کو توڑا۔ شہر بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور کہیں سانس تک کی آواز نہ تھی۔ سڑک پر مُردوں کا بچھونا تھا اور تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اُن میں کچھ سسک رہے تھے اور مصیبت کے آخری آنسو اُن کے چہروں پر نمودار ہو گئے تھے۔ گدھ خاموشی کے ساتھ لاشوں کی چیر پھاڑ میں مصروف تھے۔ اور زندوں کو بھی نوچنے میں کسر نہ کرتے تھے۔ کتّوں نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھ کر پیٹ بھرنے شروع کئے۔ غرض ان مردوں کے سرہانے کی طرف گِدھوں کا جُھنڈ تھا۔ دوسری طرف کتّوں کی قطاریں۔ وہ زخمی جوان آخری

لمحوں میں دم توڑ رہے تھے اپنا ہاتھ اُٹھا کر کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ان کی کون سنتا تھا۔ ان بدنصیبوں کی حالت پر جانور بھی روتے تھے۔ ہمارے گھوڑے بھی خوف کے مارے بدکنے اور ہنہنانے لگے۔ المختصر یہ وہ سماں تھا جو خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

مخبری کا بازار گرم تھا۔ دن بھر گرفتاریاں ہوئیں اور شام کو پھانسیاں پھانسی کا وقت سہ پہر تھا۔ جھجر کا نواب۔ بلب گڈھ کا راجہ۔ فرخ نگر کا رئیس باغی قرار دیے گئے۔ شہر کے سب دروازے اُن کی پھانسی کے وقت بند ہوئے۔ ایک ستہ فوج باجہ بجاتا ہوا اُن کو ساتھ لایا۔ کوتوالی کے پاس جہاں پھانسی تھی انگریز تماشائی بیٹھے تھے اور قہقہے لگاتے تھے۔ لاشیں ایک کرانچی میں اوندھے مُنہ پھینکدی گئیں۔

پھانسیوں کا یہ دور شہر کے واسطے قیامت سے کم نہ تھا۔ منشی ذکاءاللہ فرماتے ہیں جب روز مجرم زیادہ ہوتے تو علیحدہ علیحدہ گروہ بنا دیے جاتے۔ اور ہر گروہ دیکھتا تھا کہ اب ہمارا وار ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو پھانسیاں یعنی دیدار آخر کے واسطے روتی پیٹتی آتیں اور لاشوں کو لپٹ لپٹ کر کُہرام مچاتیں۔ جان لارنس کی لائف سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دُکان کے آگے کرسیاں رکھی جاتیں اور انگریز تماشائی ان بدبختوں کی نزاع کا تماشہ دیکھتے۔

یوں تو تمام شہر پر خدا کا قہر نازل ہو رہا تھا۔ کھانا۔ پینا۔ پہننا۔ سونا۔ کسی کو کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ فاقوں پر فاقے پڑ رہے تھے اور چھوٹے

چھوٹے بچے رزق کے واسطے بلبلا رہے تھے۔ مگر چیلوں کے کوچہ کا ایک واقعہ منشی ذکاء اللہ ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نواب شیر جنگ کے بیٹے محمد علی جان یا حکیم فتح اللہ خاں جان نے کسی سپاہی کو جوان کے زنانہ میں گھس گیا زخمی کیا یا وہ مر گیا۔ اس جرم کی سزا اس وقت جو کچھ ہوتی کم تھی۔ حکم ہوا کہ کوچہ چیلاں کے تمام مردوں کو مار ڈالو یا پکڑ لاؤ۔ چنانچہ کوئی گھر ایسا نہ بچا جہاں ایک آدھ مرد نہ مارا گیا ہو۔ کچھ زندہ گرفتار ہو کر پیش کئے گئے۔ جن کے واسطے یہ فیصلہ ہوا کہ قلعہ کے سامنے جمنا کی ریتی میں گولی سے مارے جائیں۔ چنانچہ شام کے وقت ان کو گولی ماری گئی۔ ان میں دو آدمی زندہ رہے اور بھاگ کر جمنا میں کود گئے۔ ایک مولوی وزیر الدین مولانا صہبائی کے بھانجے اور دوسرے۔ مولوی امام بخش صہبائی جو گولی کی باڑ سے مارے گئے۔ اسی گروہ میں تھے۔ ان کی موت پر نواب صدر الدین خاں آزردہ فرماتے ہیں:۔

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

انگریزی سپاہ میں زیادہ تر سکھ اور سرحدی پٹھان تھے۔ ان مسلمانوں میں بعض ایسے دیندار تھے کہ انھوں نے قتل و غارت میں کوئی حصّہ نہ لیا ان کی کوشش صرف یہ تھی کہ قرآن مجید کی بے حرمتی نہ ہو۔ وہ مسلمان گھروں میں جاتے اور قرآن مجید کو اٹھا کر چادروں میں باندھ کر باہر آ جاتے۔ چادر سر پر

رکھتے۔ کلام اللہ کو آنکھوں سے لگاتے اور روتے۔ مگر سکھوں کے دل میں گرو تیغ بہادر کے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور وہ یہ سمجھ کر کہ ان کو بادشاہ دہلی نے قتل کیا ہے۔ مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ انہوں نے طاقتور اور دیدارو جوانوں کو چن چن کر مارا۔ غضب یہ کرتے تھے کہ جوانوں کو ان کے بڈھے باپوں کے سامنے قتل کرتے۔ شہر میں اوّل تو لوگ تھے ہی نہیں جو باقی رہ گئے تھے وہ اس طرح ختم ہوئے مصنف تاریخ ہندوستان کی رائے ہے کہ وجیہہ اور خوبصورت آدمی اس کثرت سے سنگینوں سے قتل کئے گئے کہ شہر میں خوبصورت آدمی کا نشان تک نہ رہا۔

بادشاہ کی مصائب کا آغاز تو مدتیں ہوئیں کہ ہو چکا تھا بلکہ توسن مصائب منازل شباب میں سرپٹ دوڑ کر اب صحرائے انحطاط کی خاک چھان رہا تھا۔ طفولیت، جوانی، بڑھاپا، سب ہی ختم ہوئے۔ مگر مصیبتیں ختم نہ ہوئیں۔ اب گویا بادشاہی کا دوسرا نام مصیبت تھا۔ خدا معلوم کیسی بدبخت اور بے غیرت زندگی تھی کہ دنیا کی ہر حالت ختم ہو رہی تھی مگر وہ ختم نہ ہوتی تھی۔ لاچارہی و بے اختیاری آئی، افلاس و مجبوری آئی۔ بچوں کی لاشیں آئیں۔ عزیزوں کا فاقہ اور تنگی آئی، مگر نہ آئی تو موت۔ جو ان حالات کا خاتمہ کرتی۔

انگریزی قبضہ قریب قریب وسط شہر میں دہلی پر ہو چکا تھا۔ اور وہ گھڑی تھی جس کا کھٹکا بدنصیب بادشاہ کو عرصہ سے لگ رہا تھا۔ اگر تو عقل زائل ہو چکی تھی۔ ہوش و حواس درست نہ تھے اور اس وقت تو

یہ کیفیت تھی کہ وہ ایک ایک کا منہ حسرت سے تکتا تھا۔ کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ میرے کام آئے اور مجھکو ان مصیبتوں سے بچائے۔ باغیوں کے سپہ سالار بخت خاں نے بہت کچھ اُتار چڑھاؤ دئیے اور عرض کیا حضور گھبرائیں نہیں اور ہمارے ساتھ رہیں۔ ہندوستان بھر حضور کے ساتھ ہے' دِلّی گئی تو گئی سہی۔ مگر بادشاہ یہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ ظالم باغیوں نے اپنے ساتھ مجھ کو اور میرے بال بچّوں تک کو برباد کر دیا۔ انگریز اب چھوڑنے والے نہیں۔ مال اور آبرو' عزت اور ناموس اوّل تو رخصت ہو ہی چکی تھی۔ اور اگر تیموری خاندان کی کچھ رہی سہی آن باقی ہے بھی تو وہ اب گھڑی دو گھڑی میں لٹے گی۔ تاج شاہی کے وارث سرزمین شاہجہاں آباد پر دِن دھاڑے قتل ہوں گے اور بابر و اکبر کی بہو بیٹیاں دِلّی کے گلی کوچوں میں خاک چھانتی پھریں گی۔ اس کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ کیا کرے۔ وہ بخت خاں کے ساتھ انگریزوں کی تہ میں بھی پہنچ جاتا تو فاتح نکال لاتے۔ کیونکہ اس کی تقدیر میں ذلّت اور رسوائی کی انتہائی منزلیں طے کرنی تھیں۔ جن آنکھوں نے داما اور فخرو کی لاشیں دیکھی تھیں۔ ابھی اُن کو اور بیٹے کے ٹکڑے خون میں لہولہان دیکھنے تھے۔ بھاگ گیا تو ممکن تھا کہیں لڑائی میں قتل ہو جاتا یا کسی موذی ظالم کا شکار ہو کر مر جاتا۔ لیکن اس کو مرنا تھا جل جل کر اور سسک سسک کر مر مر کر اور پیٹ پیٹ کر مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی آج دونوں اس دُنیا سے رخصت ہو چکے مگر اُن کے اعمالنامے اُن کی کتاب حیات کے واقعات بآواز دُہرا رہے ہیں۔ منشی رجب علی محکمہ خبر کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ اور مرزا الٰہی بخش

بظاہر بادشاہ کے معتمد اور بہ باطن خون کے پیاسے اور منشی صاحب کے یار غار انہوں نے ساری کیفیت منشی صاحب کو سُنائی اور منشی صاحب نے جنرل ولسن اور مسٹر ہوڈسن کو۔

شہر کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اب صرف ایک کام باقی تھا۔ یعنی بہادر شاہ کو زندہ گرفتار کرنا اور خاندان شاہی سے انگریزی خون کا بدلہ لینا۔ منشی رجب علی نے مرزا الٰہی بخش کو لکھا کہ صرف چوبیس گھنٹے یعنی ایک رات دن کے لئے بادشاہ اور اُن کے خاندان کو ہمایوں کے مقبرہ میں جہاں وہ جا رہا ہے بہلا پُھسلا کر روک لو اور باغیوں کے دم جھانسے میں نہ آنے دو۔

بڈھا بادشاہ جس کو اپنی موت سے زیادہ بال بچّوں کی تباہی کا اندیشہ تھا روتا پیٹتا ہمایوں کے مقبرے پہنچا۔ یہاں دونوں فریق موجود تھے۔ اِدھر مرزا الٰہی بخش جو منشی رجب علی کی طرف سے متعین ہوئے تھے۔ اُدھر بخت خاں سپہ سالار مع اپنی جمعیت کے۔ بخت خاں نے ایک دفعہ اور کوشش کی کہ بادشاہ بال بچّوں سمیت اُس کے ساتھ بھاگ چلے مگر مرزا کا داؤں کارگر ہوا اور بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ میں بے گناہ ہوں۔ انگریز اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ بدمعاشوں کے ہاتھوں مجبور تھا۔ مجھ پر میرے معصوم بچّوں پر اور مظلوم بیوی پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ بخت کو صاف جواب دیدیا اور وہ ناامید مایوس راتوں رات کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کا ساتھ نہ چھوڑا اور طرح طرح کے دم دلاسے صرف اس لئے دئے کہ کسی طرح چوبیس گھنٹے گذر جائیں اور بادشاہ گرفتار ہو جائے تو عمر بھر عیش کروں گا۔

چنانچہ سایہ کی طرح بادشاہ کے ساتھ لگا رہا۔ مگر یہ رات اس بدنصیب انسان کی ایسی گذری ہے کہ خدا دشمن کی بھی نہ کاٹے۔ پلک سے پلک جھپکانی حرام تھی۔ دل میں رہ رہ کر جوش اٹھتا اور کہتا دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آسمان سر پر چھایا ہوا اور زمین قدموں میں بچھی ہوتی۔ مگر ٹھہرنے کی جگہ تھی نہ بھاگنے کی تاروں کا جال چاروں طرف بچھا ہوا تھا اور جدھر نظر جاتی تھی یہ ہی آسمان تھا اور یہ ہی زمین۔ کبھی پردادا کی قبر کو بوسہ دیتا، کبھی اس کی خاک اپنے منہ پر ملتا۔ آخر ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے دامنِ شب چاک کیا۔ پو پھٹنے لگی اور مرزا کی جان میں جان آئی۔

ھیوڈسن اور ولسن دونوں بادشاہ کے قتل پر آمادہ تھے۔ اور اگر یہ آمادگی پوری ہو جاتی تو نہ صرف اس بخت کا پردہ ڈھک جاتا بلکہ بہت سے افکار و آلام سے رہائی ہوتی لیکن زندہ گرفتاری کی تجویز ہوئی۔ اور دوپہر تک ھیوڈسن مع پچاس مسلح سپاہیوں کے مقبرہ کے دروازہ تک پہنچ گیا۔

یہ وہ دردانگیز منظر تھا جس کا خیال بدن کپکپا دیتا ہے۔ غریب شہزادیاں جنہوں نے گورے کی صورت تک نہ دیکھی تھی تھر تھر کانپنے لگیں، معصوم بچے کونوں میں گھس گئے: زینت محل بادشاہ بیگم نے شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ بادشاہ نے رو رو کر بیوی کو اور لپٹا لپٹا کر بچوں کو خدا کے سپرد کیا۔ اپنے چھوٹے بچے جواں بخت کو حسرت سے دیکھا۔ پاس بلایا، کچھ پڑھ کر دم کیا۔ اور اس طرح رویا کہ جواں بخت کی ہچکی بندھ گئی۔ ھیوڈسن صاحب کے تقاضے برابر آرہے تھے۔ لاچار بادشاہ باہر نکلا

اور اس کے پیچھے پیچھے بادشاہ بیگم اور جواں بخت پالکی میں بیٹھے۔ دروازہ پر پہنچکر بدنصیب بادشاہ نے بآواز بلند کہا۔

"میرے گرفتار کرنے والے کیا ہیوڈسن صاحب ہیں؟"

ہیوڈسن صاحب نے آگے بڑھ کر کہا "ہاں۔ ہتیار دیدو"

بادشاہ نے کہا "میری اور میرے بیوی بچہ کی جان بخشی کیجئے"

ہیوڈسن نے وعدہ کیا اور قیدی بادشاہ نے ہتیار حوالے کئے۔

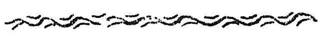
جاں بخشی کے سلسلہ میں ہیوڈسن نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ "میں بادشاہ کو زندہ لانے کی بجائے مردہ لانا زیادہ پسند کرتا تھا" مگر ان الفاظ کے ساتھ یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ "بادشاہ بے گناہ تھا اور بغاوت میں عملی حصہ لینے سے بری"

سلطنت مغلیہ کے اس تاجدار نے جس کو والیسرائے نذر دیتا تھا اس وقت جنرل ولسن سے ملنے کی خواہش کی مگر پوری نہ ہوئی اور بہادر شاہ لال کنوئیں پر اس عمارت میں جو زینت محل کے کمرہ کے نام سے مشہور ہے قید کر دیا گیا اور پہرے لگا دئے گئے۔

بادشاہ کی گرفتاری کی خبر آناً فاناً تمام شہر میں پھیل گئی شہر میں اول تو یوں ہی گذشتہ کے ہل پھر رہے تھے۔ اس خبر نے اور بھی رہی سہی کمر توڑ دی۔ باغی ظالم جنہوں نے بادشاہ کو یہ دن دکھایا رفو چکر ہوئے اور ان کی نمک حرامی کا خمیازہ زینت محل کے قیدیوں کو بھگتنا پڑا۔

بڈھے بادشاہ کا دن رو رو کر اور رات بلک بلک کر ختم ہوئی۔ ابھی

آفتاب پوری طرح سے طلوع نہ ہوا تھا کہ مخبروں نے ہیوڈسن صاحب کو خبر پہنچائی کہ بادشاہ کے دونوں لڑکے اور ایک پوتا مقبرہ میں زندہ موجود ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قتل و غارت میں نمایاں کام کئے ہیوڈسن کو اب کہاں تاب تھی۔ سو سوار ساتھ لئے اور پہنچ گیا۔ یہ تینوں شہزادے مع ایک مختصر جماعت کے وہاں موجود تھے۔ گرفتار ہوئے صاحب نے ان کو رتھ میں بٹھایا اور شہر کی طرف روانہ ہوا۔ مقبرہ ہمایوں شہر سے چار میل کے فاصلہ پر ہے مشکل سے ایک میل چلے ہوں گے کہ ہیوڈسن نے رتھ روک کر کہا "تینوں شہزادے باہر نکلیں"؟ سوار تینوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے کہ اس نے کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ گریہ و زاری کی صدائیں زمین سے آسمان تک بلند ہوئیں۔ شہزادے ہیوڈسن کے قدموں میں گرے، منت خوشامد کی، مگر بے سود۔ صاحب نے پستول ہاتھ میں لیا اور باری باری تینوں کو وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ مرزا مغل۔ قیصر سلطان اور مرزا ابوبکر تینوں کی لاشیں چوبیس گھنٹے تک کوتوالی میں لٹکی رہیں۔



بہادر شاہ کی داستان ختم کے قریب ہے جس شخص کے ادنی اشارے سے کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا وہ اس وقت سپاہیوں کے پہرہ میں خاموش گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھا تھا جب زیادہ وحشت ہوتی تو ٹہل لیتا اور پھر اٹھتا۔ کمر جھک گئی تھی۔ بیماریوں نے دم ناک میں کر رکھا تھا۔ صبح کا سہانا وقت تھا

کہ دونوں لڑکوں اور تیسرے پوتے کی خبر موت سُنی۔ کلیجہ نکل گیا۔ سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے پُر ہو گئی۔ زینت محل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کچھ سُنا؟ بچے رخصت ہوئے"

یہ کہہ کر ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

خاندان مغلیہ کے آخری تاج دار کی بے ہوشی میں بادشاہ بیگم کے پاس پانی کے چند قطروں کے سوا ہوش میں لانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ جواں بخت نے رو رو کر چھینٹے دیئے۔ زینت محل نے شوہر کا سر اپنی گود میں لیا۔ ہوش آیا تو بچوں کو یاد کر کے بدنصیب بادشاہ نے دیواروں سے سر پھوڑا۔ دن بھر یہی کیفیت رہی۔ کوئی اتنا نہ تھا کہ دو باتوں سے بدبخت کا جی بہلا دیتا۔

سچ یہ ہے کہ سب کچھ کھو کر اب زندگی کا تمام اثاثہ یہ دو لڑکے باقی رہے تھے اور بہادر شاہ کی تمام توقعات ان ہی سے وابستہ تھیں۔ اِنکی موت نے زخمی کلیجہ میں کیڑے ڈال دیئے۔ گھونسے مارتا تھا اور روتا تھا۔ سر پیٹتا تھا اور چیختا تھا۔ جس وقت یہ خیال آتا تھا کہ بدنصیب باپ کے پھول سے بچوں کو کفن بھی نصیب نہ ہوا تو زینت محل سے بلبلا کر کہا۔

"اے بیگم! میرے چاند سے مکھڑے بے گور و کفن پڑے جنگل میں سو رہے ہیں۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا نہیں کہ ان کا منہ دھلا کر کپڑے بدل دے۔ بالشت بھر کے لوتھڑوں کو ان ہاتھوں میں اسی دن کو جوان کیا تھا کہ ان کی موت پر کوئی آنسو تک گرانے والا نہ ہو۔ چیل کوّے

پچھاڑ دا سے لالوں کو نوچیں۔ کتے ان کو بھنبوڑیں۔ میں سُنوں اور زندہ رہوں۔ دیکھوں اور اُف نہ کرسکوں۔ آسمان ٹوٹ پڑتا زمین پھٹ جاتی اس سے پہلے کہ میرے چاند گہناتے۔ میرے پھول مرجھاتے اور میرے بچے دُنیا سے رخصت ہوتے۔ وہی دُنیا جو کل تک میری تھی اس وقت میری دشمن ہے۔ جنہوں نے تمام عمر میرا نمک کھایا۔ آج اُنہوں ہی نے میرے لال پھانسی پر لٹکوائے! زینت محل! میں زندہ ہوں اور میرے پیاروں کی لاشیں پھانسی پر لٹک رہی ہیں! میں موجود ہوں اور میرے بچے گور و کفن کو محتاج جنگل میں پڑے ہیں! بڑے دادا جان نے شاہجہاں آباد اسی دن کو آباد کیا تھا کہ میری اولاد بھوکی پیاسی اس سرزمین پر دم توڑے۔ دنیا ان کا تماشہ دیکھے اور ہنسے۔ زینت محل! میرے پہلو میں دل ہے پتھر نہیں۔ بہادر شاہ انسان ہے جانور نہیں مجھکو سنبھالو، پکڑو، میرا دل نکلا، میری جان چلی، اچھا، اچھا، پیارے بچوں جاؤ، بڈھا مظلوم باپ جس کی تقدیر میں تمہارا صدمہ دیکھنا تھا، مجبور ہے۔ تم اس کے پاس سے بے آب و دانہ تڑپ کر اور پھڑک کر سدھارے ہو۔ لیکن وہ بے گناہ ہے۔ تمہاری پرورش میں اگر غلطی ہوئی ہو تو معاف کرنا اور خدا کے ہاں بے قصور باپ سے مواخذہ نہ کرنا۔"

مشرقی کہانیاں عام طور سے ان الفاظ پر ختم ہوتی ہیں :-

اُنھوں کے جہاں میں پھرے جیسے دن
ہمارے تمھارے پھریں ویسے دن

لیکن بادشاہ کی داستان اس دُعا سے محروم ہوکر خاتمہ پر یہ کہلواتی ہے کہ خدا دشمن سے دشمن کو بھی یہ وقت نہ دکھائے۔ مصیبت کی کوئی قسم جسمانی یا روحانی ایسی نہ تھی جس کا قدم بہادر شاہ کی تقدیر میں شامل نہ ہو۔ خارستان زندگی کا کوئی کانٹا ایسا نہ تھا جس نے جسد شاہی کو نہ چھیدا ہو۔ البتہ ایک کسر رہی تھی اور وہ یہ کہ شہر کے گلی کوچوں میں اس کی رسوائی ہو۔ عزیزوں کے روبرو، نوکروں اور غلاموں کے سامنے ذلیل اور خوار ہو۔ رعیت کے بچّے اپنے بادشاہ کی حالتِ زار پر آنسو گرائیں۔ اور بڈھے اس کی صورت اور حالت میں خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیں۔

۲۵ جنوری ۱۸۵۸ء کو تاج برطانیہ نے خاندان تیموریہ کے اس آخری بادشاہ کو مجرم قرار دے کر ایک کمیشن کے ذریعہ سے تحقیقات کی یہ منظر بجائے خود اس قدر مؤثر اور درد انگیز تھا کہ شہر کے مرد اور عورتیں ڈاڑھیں مار مار کر روتے تھے۔ قلعہ معلّٰی کی عالیشان عمارتوں نے جو عدل شاہجہانی کے گیت گا رہی تھیں ملزم بادشاہ کی حمایت میں نالہ بلند کیا، اور اُن سفّاک تلنگوں اور ظالم مسلمانوں کے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے جنھوں نے بے گناہ انگریزوں پر ستم ڈھائے ایڈووکیٹ جنرل نے کہا

"قیدی بہادر شاہ پر چار الزام ہیں جو ایکٹ ۱۶ ۱۸۵۷ء
کے بموجب داخل جرم ہیں"

وہی شہر جہاں آباد جس کے در و دیوار پر بہادر شاہی ڈنکا بجتا تھا آج اس کو قیدیوں کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ دیوان خاص جس میں اس نے عمر بھر حکومت کی اس وقت اس کے آخری فیصلہ کا منتظر ہے۔ بادشاہ کا نحیف جسم جس میں مٹھی بھر ہڈیوں کے سوا کچھ نہ تھا لاتعداد آرزوؤں اور دعاؤں کو ہمراہ لئے ہوئے جواب کے واسطے تیار ہوا معمولی ملازم اور پیادے، جو ہر وقت سجدہ کرتے تھے اس کے باغی ہونے کی شہادت دے رہے تھے۔ وہ ایک ایک کا منہ تکتا۔ اور زندگی کے ان کھیلوں کا تماشہ دیکھتا۔ دنیا منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش اور بہادر شاہ سب کو موت کے گھاٹ اتار چکی۔ مگر مردوں کے اعمال زندوں کے واسطے سبق ہیں۔ آج کے زندہ اُن زندگیوں کو جو فنا ہو چکیں سامنے رکھیں اور زندگی کی اُن بہاروں کو غور سے دیکھیں۔ رجب علی ترقی کے میدان میں کہیں سے کہیں پہنچے، مرزا الٰہی بخش مالا مال ہو گئے مگر آج وہ تموّل و ترقی دونوں ختم ہوئے۔ بادشاہ کی اولاد اگر بھیک مانگتی ہے تو غداروں کے بچوں پر کڑاکے فاقے گزر رہے ہیں!

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

اس نازک موقعہ پر کہ اپنے بیگانے اور دوست دشمن ہو گئے۔ ذاتی دولت اور جھوٹی حشمت نے عزیزوں کو غیر بنا دیا۔ بدبخت بادشاہ کو

اپنی موت کا یقین کامل ہو گیا۔ آخری بیٹی پر زینت محل کو سپردِ خدا کرکے
اس نے جواں بخت کو سینہ سے لگایا دیر تک روتا رہا۔ بیوی بچوں کو
خدا کے سپرد کیا اور زینت محل سے کہا "میری اولاد اور عزیزوں نے
برطانیہ سے جو نمک حرامی کی اس کی پاداش میں مجھ پر جو آفت آئے وہ کم۔

۹۔ مارچ ۱۸۵۸ء منگل کو ٹھیک دس بجے وہ شخص جو بادشاہ کے نام
سے مشہور تھا اور جس کی زندگی آج بھی کتاب شہنشاہی کے اوراق پارینہ
تھی ملزم کی حیثیت سے عدالت میں اس غرض سے پیش ہوا کہ اپنے
جرائم کا جواب دے۔ اس کے جسم میں رعشہ تھا، اس کے ہاتھ پاؤں
کانپ رہے تھے۔ اس کے اپنے عزیز و اقارب دوست آشنا
اس کی بغاوت کی شہادت اور اس کے مجرم ہونے کا ثبوت دے چکے
تھے۔ گواہیوں پر گواہیاں اور قسموں پر قسمیں اس کے خلاف گذر رہی
اور کھائی جا رہی تھیں۔ آسمان چشم زدن میں رنگ بدل چکا تھا۔ اور
بہت تھوڑی سی امیدوں اور عارضی وعدوں پر دوست دشمن بن گئے
تھے۔ شاہجہان آباد جس کا چپہ چپہ ممنون کرم تھا دیدے بدل چکا
تھا۔ اور قدیمی نمک خوار اس کی موت کے ساعی ہو گئے تھے۔ اس نے
اشک آلودہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا، گردن نیچی کی اور
کچھ سوچ کر کہا۔

"یہ لوگ جو اس وقت میری جان کے درپے ہیں کبھی مجھ پر جان
چھڑکتے تھے۔ جنہوں نے عمر بھر میری جان کی قسمیں کھائیں آج میری موت کا

فتوے دے رہے ہیں! جن کی زبانیں میری درازی عمر کی دعائیں دیتی تھیں۔ اُن کے عمل اس وقت میری بربادی کے طلبگار ہیں۔ مجھ پر جو الزام قائم کئے گئے ہیں اُن کا کیا جواب دوں۔ آج میرا کوئی گواہ یا حمایتی نہیں۔ دُنیا جو کچھ کہہ رہی ہے صحیح ہے۔ ان سب کے مقابلہ میں ایک تن تنہا شخص کیا کہہ سکتا ہے اور کس طرح جھُٹلا سکتا ہے۔ میں صرف اس قدر کہتا ہوں کہ بے گناہ ہوں اور خدا شاہد ہے کہ یہ الزام سرتاپا غلط اور بُہتان ہیں۔ میں اپنا بیان پیش کرتا ہوں اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ الزام غلط، شہادت جھوٹی، اور میں بے گناہ ہوں۔ بلوہ سے پہلے میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا۔ صبح آٹھ بجے ہوں گے کہ جھروکوں کی طرف سے غل غپاڑے کی آواز میرے کان میں پہنچی۔ اور معلوم ہوا کہ یہ باغی میرٹھ میں قتل و خونریزی کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ میں نے فوراً حکم دیا کہ قلعہ کے دروازے بند کردئے جائیں۔ میں نہیں جانتا کہ اور کیا کرسکتا تھا۔ قلعہ دار نے مجھ سے خواہش کی کہ دروازے کھلوا دوں اور وہ باغیوں سے جاکر گفتگو کرے۔ میں نے اس کو مناسب نہ سمجھا۔ اُس وقت میری کیفیت جو تھی بیان نہیں کرسکتا۔ فریزر صاحب اور قلعہ دار کے پیام میرے پاس آئے کہ دو توپیں اور دو پالکیاں بھیجدو۔ پالکیاں قلعہ دار نے اس لئے منگوائی تھیں کہ اس کے ہاں دو میمیں مہمان تھیں میں نے پالکیاں فوراً بھیجیں۔ توپوں کا حکم دیا۔ مگر پالکیاں راستہ

میں تھیں کہ فریزر قلعہ دار اور مہمان سب مارے گئے۔ میں اس تشویش میں تھا کہ باغی قلعہ میں گھس آئے۔ چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا۔ پھر پہرے لگا دئیے اور کہا "جان کی خیر چاہتے ہو تو چپکے بیٹھے رہو۔" میں ڈر کے مارے کانپنے لگا، اور سیدھا اُٹھ زنانہ میں چلا گیا۔ مغرب سے کچھ پہلے یہ ظالم لوگ چند انگریز مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے لاتے اور اُن کو قتل کرنا چاہا۔ ان بے گناہ قیدیوں کی صورت دیکھ کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ظالموں کی منت کی کہ رحم کرو اور قتل سے باز آؤ۔ مگر اُن کے دل نہ پسیجے۔ ہاں میری گریہ وزاری پر اس وقت خاموش ہو گئے۔ اُنہوں نے تین دفعہ یہی کہا۔ میں نے ہر مرتبہ اُن سے التجا کی۔ آخری مرتبہ اس خونخوار گروہ نے مجھ کو اور منتوں کو جھڑک کر اُن کو قتل کر دیا۔ ممکن ہے میرے سپاہی باغیوں کے ساتھ شریک ہوں اور اُنہوں نے بھی اس ظلم میں حصہ لیا ہو۔ مگر حاشا وکلا میری اجازت و تحریک سے ہرگز نہیں۔ اپنی خوشی سے۔ یہ جرم کہ قلعہ دار اور فریزر صاحب میرے حکم سے قتل ہوئے قطعاً غلط ہے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی ثبوت نہیں کہ میں اپنے خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ مجھکو اس کا علم نہ تھا۔ گواہوں کا یہ بیان کہ میں نے حکم دیا صریح الزام و بہتان ہے۔ اور مجھ بے گناہ پر سخت ظلم اور ناانصافی ہے۔ اب رہے باقی معاملات میری مُہر اور احکام کے متعلق اُن کی کیفیت یہ ہے کہ باغیوں نے مجھے اپنا

قیدی بنا لیا تھا اور میری آڑ میں جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ میرے منشی سے لکھواتے۔ مُہر لگاتے اور مجھ سے دستخط کرواتے۔ کیا عقل سلیم گوارا کر سکتی ہے کہ اگر میں ذرّہ بھر بھی اختیار رکھتا تو کیا یہ الفاظ سُن سکتا کہ "ہم زینت محل کو چھین لیں گے اور مار ڈالیں گے"! یا میرے بیوی بچے اتنے گئے گذرے ہوتے تھے کہ باغی اُن پر قبضہ کریں اور میں اُف نہ کرسکوں؟ اُنہوں نے میرے خسر یعنی زینت محل کے باپ شمشیر الدولہ کو قید کیا اور میں ہوں نہ کرسکا۔ مجھ سے یہاں تک کہا کہ میں اپنی بیوی زینت محل کو ان کے حوالہ کردوں اور میں خون کے سے گھونٹ پی کر چپ ہو گیا۔ میری شرم وحیا، غیرت و حمیت کیا اِسی کی متقاضی تھی کہ میں اُن کے احکام سُنوں اور صبر کردوں۔ میں مجبور تھا لاچار تھا اور کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی! ظالموں نے جو چاہا وہ کیا اور جو چاہتے تھے وہ کرتے تھے! میں بے بس تھا، بے کس تھا۔ میرے عزیز، میرے نوکر، سب اُن سے مِل گئے۔ اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ وہی لوگ جو کل تک میرا کلمہ پڑھتے تھے، جن کا مُنہ حضور حضور کہتے خشک ہوتا تھا۔ آج میرے قتل و تباہی کے درپے ہیں۔ اور میرے خلاف گواہیاں دے رہے ہیں۔ میں نے مصمم قصد کیا کہ ہجرت کر جاؤں اور دِلّی چھوڑ کر ارضِ مقدس میں اپنی زندگی کے دِن پورے کروں مجھ جیسا بدنصیب شخص جس کی زندگی مصائب کا انبار ہو اس کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ مگر یہ قصد بھی پورا نہ ہوسکا اور ان لوگوں نے

مجھے نہ اُکسنے دیا۔ اور آج کے دن کو زندہ رکھا۔ میں نے یہاں تک کوشش کی کہ قلعہ معلّٰی کو خیر باد کہوں اور قطب جا پڑوں۔ گیروا کپڑے پہنوں اور دُنیا سے قطع تعلق کروں۔ اور وہاں سے اجمیر چلا جاؤں اور کچھ دِن درگاہ میں رہ کر مکّہ معظمہ کا رُخ کروں۔ مگر یہ بھی نہ ہوا۔ جن لوگوں نے میگزین توڑا، خزانہ لوٹا، جو کہنے کو میرے سپاہی اور اصل میں بادشاہی کر رہے تھے۔ وہ آقا تھے اور میں اُن کا غلام۔ اُنہوں نے زینت محل کے مکان پر حملہ کیا۔ اور لوٹ مار کے لئے چڑھ دوڑے تقدیر اچھی تھی کہ دروازہ نہ ٹوٹا ورنہ اُنہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی کیا اس پر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ میرے دوست تھے۔ اور جو کچھ کر رہے تھے میرے اشارے سے؟ اگر یہ میرے تھے تو کیا اِس لئے کہ مجھ سے کہیں "اپنی بیوی ہمارے حوالہ کر دو"! وقت نے مجھ کو جو کچھ سُنوایا میں نے سُنا! اور تقدیر جو کچھ دکھا رہی ہے دیکھ رہا ہوں! حبشی قنبر نے مجھ سے حج کی رخصت لی اور میں نے دی۔ مجھے کیا خبر کہ وہ ایران جا رہا ہے۔ مجھ سے ایران سے واسطہ کیا؟ یہ سب باغیوں کے کرتوت ہیں۔ اُنہوں نے مجھ کو اتنا ذلیل اِس قدر حقیر اور اس حد تک مجبور سمجھ رکھا تھا کہ میرے دیوان خاص بلکہ تسبیح خانہ تک جوتیاں پہن کر پھرتے تھے! کیا میرے فرماں روا اور اُن کے محکوم ہونے کا یہی ثبوت ہے؟ ایک میں اکیلا ایک طرف تھا اور یہ ساری دُنیا ایک طرف! مگر میں جانتا تھا اور علی الاعلان اُن سے کہتا تھا کہ بندر کی بلا طویلے کے سر

نزلہ میرے اوپر گرے گا۔ میرے پاس فوج نہ خزانہ۔ روپیہ نہ پیسہ۔ اُن کو ضرورت کیا تھی کہ میری سُنتے؟ جس رات کو یہ شورش برپا ہوئی اور باغی قلعہ میں پہنچے۔ میں نے اُسی وقت ایک سانڈنی سوار لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں بھیجدیا۔ میں بھاگا ضرور مگر جان کے خوف سے۔ جب میں نے حکام کے تیور بگڑے دیکھے تو ہمایوں کے مقبرے میں چلا گیا۔ باغیوں نے ہر چند کہا کہ ہمارے ساتھ چلو۔ مگر میں جانتا تھا کہ اور مٹی پلید ہو گی۔ آپ نے مجھے طلب کیا جان کی امان دی۔ میں حاضر ہو گیا۔

میں وہ شخص ہوں جس کی بدنصیبی پر تقدیر بھی رونے کا حق رکھتی ہے۔ اِس لئے کہ زندگی کا کوئی لمحہ اطمینان سے نہ گذرا! جوانی اور بڑھاپا دونوں دُکھ پیٹتے پیٹتے اور رنج سہتے سہتے بسر ہوئے! چند روز باقی ہیں وہ بھی نہ معلوم کیا کیا دکھائیں گے! جن آنکھوں کی ایک گردش دُنیا کو مالا مال کرتی وہ عمر بھر روئیں اور اتنا روئیں کہ آنسو خشک ہو گئے! جو ہاتھ امورِ سلطنت کو ایک اشارہ میں زیر و زبر کر دیتے اُنہوں نے جوان جوان بیٹوں کے جنازے ڈھوئے۔ اور اتنے ڈھوتے کہ اب سکت باقی نہ رہا! خاندانِ شاہی کی ناموس میری آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہوئی۔ مجھ پر اور میرے بچوں پر کڑا کے کے فاقے گذرے! کلیجے کے ٹکڑے میرے سامنے خون میں نہائے!!

اگر اس کے بعد بھی میں کسی سزا کا مستحق ہوں تو خدا کی مرضی مقدم ہے اور میں اُس کے واسطے تیار ہوں۔



طوفانِ حیات میں بہادر شاہ جیسی اور بہادر شاہ سے ارفع بہت سی صورتیں زیر وزبر ہوئیں۔ دِلّی کے کھنڈر ان مقتدر ہڈیوں سے پٹے پڑے ہیں جن کی زندگی پر کمال ڈنکا بجا رہا تھا۔ لیکن اس بڈھے بادشاہ نے نہ معلوم کس منحوس گھڑی میں جنم لیا تھا کہ مر کر بھی وطن کی خاک نصیب نہ ہوئی۔ اس کا بیان اس قدر درد انگیز اور جگر خراش تھا کہ دشمنوں کے بھی آنسو نکل پڑے اور جنہوں نے شہادتیں دے کر اپنے اعمالنامے سیاہ کئے تھے انگشت بدنداں رہ گئے اور وہ وقت آن پہنچا کہ فیصلہ کے یہ آخری الفاظ جہان آباد کے در و دیوار میں گونجے۔

"بہادر شاہ مجرم ہے اس لئے وہ جلاوطن کیا جاتا ہے"۔

بہادر شاہ کے چار جشن ختم ہو چکے اور زندگی کی فانی بہاریں اپنے اپنے رنگ دکھا کر رخصت ہوئیں۔ مداری کی یہ کٹھ پتلیاں کاغذی لباسوں میں خوب اُچھلیں اور کودیں۔ رات کے مزے ساری رات لوٹے اور عیش کی دیویاں صبح تک ہم آغوش رہیں۔ مگر اب وہ مجلس اُکھڑتی ہے اور مہمانانِ شب ایک ایک کر کے رخصت ہوتے ہیں۔

وہی سرزمین جس نے بہادر شاہی حکومت کے نقارے بجائے اور اس کے پاؤں چومتی رہی آج اُس کو دھکے دے رہی ہے تقدیر شاہی

کا فیصلہ موسم گرما کی دھوپ کی طرح آناً فاناً شاہجہان آباد کے درودیوار پہ پھیلا۔ چاروں طرف کہرام مچ گئے۔ اور ہر گھر سے رونے پیٹنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جب وہ ساعت آئی کہ بدنصیب بادشاہ جنگی پہرے میں دِلّی سے وداع ہو تو خلقت اندھیرے منہ سڑکوں پر آ بیٹھی۔ یہ وہ صبح تھی جس میں ماؤں نے اپنے معصوم بچوں پر کھانا پینا حرام کیا اور جب تک اپنے بادشاہ کو آنسوؤں کے حلقہ میں خدا کے سپرد نہ کر لیا چولھوں میں آگ نہ سلگائی!

رونے والوں میں ہزاروں اس کے اپنے نمک خوار اور سینکڑوں وہ تھے جو اس کے باپ دادا کی دی ہوئی جاگیر سے روٹیاں کھا رہے تھے!

باوجود سخت اہتمام کے راستہ مخلوق سے پٹا پڑا تھا اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنکھوں کی لڑیاں نہ بہہ رہی ہوں۔ بادشاہ ڈولی میں سوار تھا۔ دو بیبیاں زینت محل اور تاج محل اور دو لڑکے جواں بخت اور عباس شاہ ساتھ تھے۔ گوروں کا پہرہ تھا اور لوگوں کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ سپاہی کی صورت سے ڈر لگتا تھا مگر خلقت اپنے بادشاہ کی اس قدر مشتاق تھی کہ خوف و ہراس بھول گئی اور پروانوں کی طرح اس شمع پر گر پڑی۔ بادشاہ نے ڈولی کے پردے اٹھا دیے۔ آنکھیں سفید ڈاڑھی پر آنسو گرا رہی تھیں۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف تھے اور اس طرح جلاوطن بادشاہ دِلّی

والوں کو خدا کے سپرد کر رہا تھا۔

المختصر پردۂ دُنیا کی وہ ہولناک ساعت جب جہان آباد نے اپنے ناشاد و نامراد بادشاہ کو وداع کیا ختم ہوئی۔ تاج محل کلکتہ سے واپس ہوئی۔ اور شاہ بدبخت رنگون روانہ ہوا۔

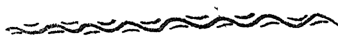
خاتمہ

غدر ۵۷ء کی قیامت کو ساڑھے پانچ سال گذر گئے۔ شہر میں امن چین ہے۔ مگر جہاں آباد کے دل سے ابھی وداعِ ظفر کا دردانگیز سماں فراموش نہیں ہوا۔ انقلاب کی روشن تصویریں چپہ چپہ پر آویزاں ہیں اور عروج و انحطاط کے جیتے جاگتے تماشے کارخانۂ حیات کے بازی گر انجام دے رہے ہیں۔ جن عالیشان محلوں پر نوبت و نقارے بجتے تھے وہ ماتم کدے بن چکے اور جن دروازوں پر ہاتھی جھومتے تھے اُن کی اینٹ بج گئی۔ جن کے پیٹ دوسرے دستر خوانوں سے بھرتے تھے وہ توشہ خانوں کے مالک ہیں اور جن کے بدن ثابت کپڑوں کو ترستے تھے راج کر رہے ہیں۔ عفت و عصمت کی وہ دیویاں جن کو چوکھٹ سے باہر قدم نکالنا حرام تھا، مٹھی بھر چنوں کے واسطے سربازار گڑگڑا چکیں اور سنگ دِل مکار جن کی مخبری پر سینکڑوں بے گناہ دُنیا سے رخصت ہو چکے خوش و خرم ہیں۔

بہادر شاہی چمن کی خوش الحان بلبلیں اور ہزار داستان طوطیاں

خوب چہکیں اور خوب بولیں۔ اقبال نے حکومت کے موتی تاج شاہی پر قربان کئے اور اطمینان کی گھٹائیں دِلّی والوں پر جھوم جھوم کر برسیں۔ مگر جب لیلائے شب نے اپنا گھونگٹ ہٹایا اور جلسہ درہم برہم ہوا تو چنبیلی اور موتیا کے گجرے اور بدھیاں جو دماغوں کو مہکا رہے تھے خزاں کے پہلے ہی جھونکے میں فنا ہوئے۔ خاموش شمع کا گُل اور مرجھائے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیاں بزم عشرت کا راگ الاپتی تصویر انقلاب میں جذب ہوئیں۔ یاسمین و گلاب سرنگوں ہوئے اور سرو پہ بہار آئی۔

غدر ۵۷ء کے باغی گنہگاروں کی بدولت جو مصیبت معصوم بے گناہوں پر ٹوٹی جی چاہتا ہے اس کی پوری تصویر کھینچ دوں مگر کس کس کا رونا روؤں۔ انسان نہیں خاندان، اور دو چار نہیں سینکڑوں ہزاروں ایسے تباہ و تاراج ہوئے کہ العظمۃ للہ۔



بساط آسمانی کے ستاروں زحل و مشتری نے عروس فلک کے نوشہ قمر چہاردہم نے، مشرقی شہسوار آفتاب عالمتاب نے انسانی دنیا کے بہت سے انقلاب دیکھے اور خوشا جہان آباد کا خون جو بہا گرا آج تک دامن تاریخ سے خشک نہیں ہوا۔ مگر عقل سلیم دیوانی ہوگی۔ قلب صحیح کے پرخچے اُڑیں گے اور چشم بینا اندھی ہو جائے گی جب یہ سُنے گی کہ جن دہلیزوں پر پرندہ پر نہ مار سکتا تھا اس کے رہنے بسنے والی

خواتین کی قیمت چند روٹیاں یا سیر دو سیر آٹا تھا۔ دل نہیں چاہتا کہ کہوں اور قلم کی زبان پر وہ الفاظ آنے دوں جو قلب کے ٹکڑے اُڑا دیں۔ لیکن کہتا ہوں اور رو کر کہتا ہوں۔ کتنا نازک وقت ہے اور متواتر فاقے یہ کیا رنگ دکھاتے ہیں کہ دبیعہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے !!!

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو



آج ۷ رنومبر ۱۸۶۲ء کو وہ بدبخت روح جو نواسی سال بہادر شاہ کے جسم میں موجود رہی زندگی کے تمام تماشے دکھا کر وداع کی تیاریاں کر رہی ہے۔ دِن ڈھل چکا اور دِن کے ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانہ عمر بھی لبریز ہو گیا۔ رنگون کی خاک اس کو آغوش میں لیتی ہے۔ جو خاندان تیموریہ کا آخری چراغ تھا۔ جس نے جہاں آباد میں جنم لیا۔ وہ وطن سے ہزار ہا کوس دور ایک معمولی پلنگ پر دم توڑ رہا ہے۔ سکرات طاری ہے۔ سانس اُکھڑ چکا۔ جس کی زندگی بیچ پچ کا میلہ تھی۔ جس نے زندگی کا ہر لمحہ جمگھٹوں میں گذارا آج صرف تین آدمی ایک بیوی اور دو بچے اس کے دم واپسیں میں ساتھ ہیں۔ آفتاب ابھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس بدنصیب بادشاہ نے فانی دُنیا کو اپنی عسرت کی تصویر دکھا کر دُنیا سے کوچ کیا۔ اور شاہجہاں آباد کا یہ گوہر آبدار رنگون کی خاک میں ابدی نیند سو گیا۔

متفرقات

جیسا کہ میں نے کہیں کہیں اشارہ کیا بھی ہے اِس کتاب کا مضمون غدر کی ابتدا اور انتہا قلعہ کے واقعات اور نتائج تفسیر ہیں۔ اِس خدائی فیصلہ کی کہ قوم کی بہتری اور بدتری کی ذمہ داری اِس کے افعال پر ہے۔ دُنیا کا شاید ہی کوئی گناہ ایسا ہو جس سے قلعہ معلّٰی کے شہزادے اور شہزادیوں کا دامن پاک ہو۔ ظلم و ستم عیاشی و آوارگی لہو ولعب، عیاری و بدمعاشی مکر و دغا۔ غرض کوئی لغزش و نالائقی ایسی نہ تھی جو موجود نہ ہو۔ اور یہ کرتوت اُن لوگوں کے تھے جو تخت شاہی کے حق دار اور بنی نوع اِنسان پر حکومت کے خواستگار تھے۔ انگریزوں پر جو قیامت تلنگوں نے ڈھائی قلعہ اس میں برابر کا شریک تھا۔ یہ سنگ دِلی اور بے رحمی اِس حد تک پُہنچ چکی تھی کہ اسکے جواب میں شہر کی جو کچھ تباہی ہوئی اور شہر والوں کا جو حشر ہوتا جائز تھا۔

ہر مصنّف اور مؤلف جانتا ہے اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اُس کو اپنے ہیرو سے کِس قدر تعلق ہوتا ہے۔ یہی ہے وہ تعلق جو بعض بعض جگہ واقعات پر بھی سبقت لے گیا میرے سامنے وداعِ ظفر بہ ظفر کی

شخصیت ہے۔ اس کی بادشاہی کے متعلق جہاں میرا عقیدہ یہ ہے کہ ان تمام واقعات کی ذمہ داری اس کے نمک حرام مصاحبوں پر ہے جن کی گواہیوں نے اس کو کالا پانی دکھایا۔ وہاں میں ہوڈسن صاحب کے ایمان کا مداح ہوں کہ باوجود ان مظالم اور قتل عام کے جو سفاک ہندوستانیوں نے انگریزوں کا کیا اور جس کو دیکھ کر اور سن کر انگریز جس قدر برافروختہ ہوتے کم تھا۔ اس نے اپنا ایمان ہاتھ سے نہ دیا اور شرافت کی ایسی مثال قایم کر دی جس پر اس کی قوم مدۃ العمر اور اس کی روح ہمیشہ فخر کرے گی۔ اس نے اپنے روزنامچہ میں صاف لکھ دیا کہ بادشاہ کا دامن بغاوت میں عملی حصہ لینے سے پاک ہے۔ ان حالات میں یہ رائے کسی اعتبار سے بھی غلط نہیں ہوسکتی کہ ظفر کی سیاسی زندگی کی تباہی کے ذمہ دار اس کے وہ عزیز اور احباب ہیں جنہوں نے غدر سے پہلے اپنی ضدوں اور ناز برداریوں کے جال میں گرفتار رکھا اور غدر کے بعد مخبری اور گواہیوں کے شکنجہ میں کس دیا۔

میں نے شاید کہیں لکھا بھی ہے کہ جس روز سب سے پہلے قلعہ میں بے گناہ انگریزوں اور میموں کا قتل عام ہوا تو دِلّی والے کچھ دور اندیشی یا فہم وفراست کی وجہ سے نہیں محض قہر خدا سے ڈر کر بلبلا اُٹھے اور کہا کہ عنقریب شہر پر کوئی آسمانی آفت ٹوٹے گی۔ شاید داغ کا مصرعہ ہے۔

آفت اِس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی

حق یہ ہے کہ اگر انگریزوں میں منصف مزاج اور سمجھدار نہ ہوتے تو یقیناً مظلوم بادشاہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو ظالم شہزادوں کا ہوا۔

مجھے ظفر کی انسانی زندگی سے بحث ہے اور میرا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی بہت اچھا انسان تھا اور یہ کہ اسی آسمان کے نیچے ایک تنِ واحد پر دُنیا کی اس قدر آفات کا بھی ہجوم ہونا ممکن ہے۔

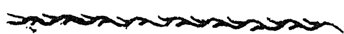
اِس کتاب میں مجھے جہاں بادشاہ کی اِس زندگی سے تعلق ہے جو سیاست سے علیحدہ تھی وہاں رو رہا ہوں مُسلمانوں کے اس تمدن اور اس معاشرت کو جو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی اور جن پر آج مغربی اثر اس بُری طرح غالب آرہا ہے کہ پناہ بخدا۔

مَیں جانتا ہوں کہ جس چیز کو میں پیٹ رہا ہوں وہ ختم ہو چکی مُسلمانوں کے وہ جوہر جو مدتوں مایۂ ناز رہے آج عیوب سے بدل گئے اور وہ خلوص ایسا رخصت ہوا کہ گویا اس کا مُسلمانوں میں نام ہی نہ تھا۔ میں اگر وہ پچھلا رنگ نہ دیکھ چکا ہوتا تو یقیناً موجودہ گلچھروں میں مگن ہوتا اور اپنی دنیا اپنی چار دیواری میں ختم سمجھتا۔ لیکن اس کا کیا عِلاج کہ آنکھ جو کچھ دیکھ چکی ہے دِل وہی ڈھونڈھ رہا ہے۔ اس آرزو کے پورا ہونے کا وقت بھی آگیا اور موت تمام خواہشوں کا خاتمہ کردے گی۔

شاہی خط

دِلّی والوں کو تو اب نہیں مگر دِلّی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بہادر شاہ کا خط اپنے وقت میں جواب نہ رکھتا تھا۔ میر پنجہ کش شہر کے مشہور خوشنویس بادشاہ کے ہمعصر تھے۔ برسوں دونوں نے ساتھ ریاضت کی اور اِس محنت کے فن کو کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ میر صاحب کا خط ہندوستان میں بے نظیر تھا۔ مگر بادشاہ کی خوشخطی کے وہ بھی مدّاح تھے۔

دفترِ عِصمت کے مقابل حضرت صابر بخش رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ ہے اُن کے وصال پر بادشاہ نے لوح مزار اپنے ہاتھ سے لکھی اور اُن کے صاحبزادے کی خدمت میں روانہ کی۔ اِس لوح کے ساتھ بادشاہ نے جو خط لکھا ہے اس کی اور اس لوح کی عکسی تصاویر جو شائع ہو رہی ہیں بہادر شاہ کی خوشخطی اور حُسن عقیدت کا کافی ثبوت ہیں ان دونوں عکسی تصاویر کے ساتھ شاہ مرحوم کے ایک اور خط کی تصویر بھی شائع ہو رہی ہے۔ اِس خط سے معلوم ہو گا کہ شاہ بدبخت کے دِل میں خوفِ خدا کس درجہ تھا۔ غربا و طلباء کے ساتھ کیسی ہمدردی تھی اور بزرگوں کے ساتھ کس قدر عقیدت تھی۔



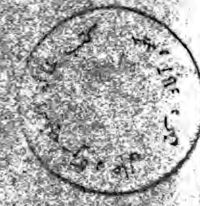
خادم الفقرا ابوظفر سراج الدین محمد
بهادر شاه بادشاه غازی

پیشوای عارفین مقتدای کاملین قدوة السالکین سید الواصلین [illegible]

بعد سلام مسنون الاسلام عارض خدمت فیض درجت قدر سیر طعام دست خاص فرستاده شد [illegible] مقتدای عارفین [illegible]

[illegible] خاص [illegible] خانقاه [illegible] الفقرا [illegible]

[illegible] رمضان المبارک سنه [illegible]



بادشاہ کی شاعری

ظفر کی شاعری مملکت سخن میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے اور اس کے چاروں دیوان کلیات ظفر کے نام سے مشہور ہیں۔ دوران غدر میں اور اس کے بعد اس کا کلام جو ان ہی آفات سے متعلق ہے مدتوں دِلّی والوں کی زبان پر رہا۔ یہ بحر طویل کی غزلیں اب بھی کبھی کبھی بھولے بسرے کسی بڈھے ٹھڈے سے سننے میں آجاتی ہیں۔

ذوق کے شاگردوں میں جس طرح داغ نے قبولیت عام کا ایسا ڈنکا بجایا کہ اب تک کانوں میں وہ گونج موجود ہے۔ اسی طرح ظفر کے کلام کی شیرینی بھی زبان کو ایک خاص لطف دے رہی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مزا آیا جو تھا کچھ دل کو قاتل زخم کھانے میں
نمک پاشی سے حاصل اور بھی لذت لگی ہونے

وہ عنایت ہو ظفر پر جس سے مٹ جائے تمام
بارِ غم جو اس کی اے شاہِ رسل چھاتی پہ ہے

اگرچہ خاکساری کیمیا کا سہل نسخہ ہے
ولیکن ہاتھ آیا جس کے دشواری سے ہاتھ آیا

قطعہ

وہ ہم سے وعدہ کر جاتے ہیں اکثر شب کے آنے کا
مگر آتے نہیں ہرگز کہ جا کر بھول جاتے ہیں
گذر جاتی ہے ساری رات کہتے کہتے یہ ہم کو
اب آتے ہیں اب آتے ہیں اب آتے ہیں اب آتے ہیں

کدورت دل میں ہے ظاہر صفائی گر ہوئی تو کیا
ملاپ اُن سے ہوا تو کیا جدائی گر ہوئی تو کیا
ہم اپنی جان تک ہیں اس بت خود کام پر دیتے
نہیں کوڑی بھی یہ زاہد خدا کے نام پر دیتے

ظفر کا فارسی کلام

سالہا گردیدہ ام من در تلاش کیمیا
دیدہ ام اکسیر اگر آں خاک پا را دیدہ ام

چوں تو در عالم ندیدم مے کشی صوفی وشے
اے ظفر بسیار اند و پارسا را دیدہ ام

ختم شد

نوٹ پبلشر

حضرت والد مغفور نے یہ کتاب اگست ۱۹۲۴ء میں بمقام گنگا پور سے شروع کی تھی اور پہلی نوبت وہیں لکھ لی تھی دوسری نوبت دہلی میں لکھ رہے تھے کہ نومبر ۱۹۲۴ء میں اُنکی بہو مشہور ادیبہ محترمہ خاتون اکرم کا انتقال ہوگیا، پھر مدرسہ کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئیں اور تین سال تک دوسری نوبت ختم کرنے کی نوبت نہ آئی ۱۹۲۸ء میں جب میں نے بہت اصرار کیا تو دو تین ماہ میں کتاب پوری کردی۔ آخری نوبت حضرت مصنف مرحوم نے اپنے بعض احباب کو خود سُنائی تھی جو ایک ایک سطر پر سر دُھنتے اور روتے رہے۔ دو ایک صاحبوں نے مصنف کو یہ مشورہ دیا کہ کتاب بے انتہا جوش میں لکھی گئی ہے کہیں حکومت ضبط نہ کرلے مجھے اتنا خیال ہے کہ حضرت والد مغفور نے آخری نوبت میں سے فقرے کے فقرے نکال دئے اور سطریں کی سطریں بدل دی تھیں۔ اگر آخری نوبت بغیر ترمیم کئے اُسی طرح شائع ہوجاتی تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے مٹنے اور مشرقی تہذیب کے اُجڑنے پر قیامت کا مرثیہ ہوتا۔ نوبت پنج روزہ پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی حضرت مصنف کے سامنے اسکے چار اڈیشن ہزار ہا کی تعداد میں شائع ہوکر ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ نوبتِ پنج روزہ یا وداعِ ظفر ان کتابوں میں سے ہے جو حضرت مصنف کو بہت عزیز تھیں۔

رازق الخیری

انتباہ واطلاع

نوبت پنج روزہ یا وداعِ ظفر کا دائمی حق اشاعت محفوظ ہے براہ کرم کوئی صاحب اِسے یا اِسکے کسی حِصّہ کو بغیر میری اجازت شائع نہ فرمائیں ورنہ اخلاقی ہی نہیں قانونی مجرم بھی ہونگے اور اُنہیں اس کا بہت برا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ہاں تاجران کتب اِس کتاب کی نیز حضرت علامہ مغفور کی دوسری کتابوں کی جس قدر جلدیں چاہیں دفتر عصمت دہلی سے طلب کرسکتے ہیں۔ تاجرانہ کمیشن معقول دیا جائے گا۔

رازق الخیری

غدر کی ماری شہزادیاں

یا دہلی میں میلہ ۱۸۵۷ء کے غدر کی لٹی ہوئی شہزادیوں کی دل

ہلا دینے والی آپ بیتی۔ غدر نے دلی کی بیگمات پر جو قیامت توڑی تھی خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ قلعہ معلیٰ کی رہنے والیوں نے در در بھیک مانگی۔ جن کے دسترخوان سے جانوروں کے پیٹ بھرتے تھے۔ متواتر کئی کئی وقت انہوں نے فاقے کئے اور کھیل کا دانہ تک میسر نہ ہوا۔ جو سونے چاندی میں کھیلتی تھیں وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئیں۔ ان کی دردانگیز داستان انہیں کی زبان میں اور پھر حضرت مصور غم کا بیان! ایک ایک لفظ دل میں گڑتا اور کلیجہ کے پار ہوتا ہے بے گناہوں کی پھانسیاں، تخت و تاج والوں کی بے گور و کفن لاشیں، مخبروں کے مظالم، بچوں کے جگر خراش نالے، عورتوں کی بے چارگی و بے کسی اور شہری آبادی کی بربادی، غرض اس داستان کا ہر ہر صفحہ عبرت ہے۔ اوپر تلے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ کئی کئی رنگ کی تصویریں بھی ہیں۔ قیمت صرف ۱۲ار

دلی کی آخری بہار

۶۰ برس پہلے دلی کیا تھی۔ مرد عورت بوڑھے بچے کس طرح بے فکری اور سادگی کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھاتے تھے۔ میلے ٹھیلے کس طرح منائے جاتے اور سیر و تفریح کس طرح کی جاتی تھی۔ اس کا جواب اس کتاب میں ملیگا۔ جو نصف صدی پہلے کی معاشرت محبت تعلقات اور وضعداری کی دردانگیز کہانیاں اور دلی کی بربادی کے جگر خراش افسانے ہیں جن میں علامہ مغفور نے انشاپردازی ہی کا کمال نہیں دکھایا۔ قلعہ معلیٰ کی کوثر سے دھلی ہوئی بیگماتی زبان ہی نہیں لکھی۔ بلکہ فسانہ شب غم سنا کر دردمند دلوں کو تڑپا دیا ہے۔ بیس نہایت دردانگیز سبق آموز افسانے اور مضامین ہیں۔ قیمت عمر

حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کے مضامین کے ۲۱ جدید مجموعے

قرآنی قصے عمر	سیاحت ہند عمر	مسلی ہوئی پتیاں ۶ر	یادگار تمدن ۶ر
عروس مشرق ۱۲ار	گرداب حیات عمر	داستان پارینہ ۱۲ار	دلی کی آخری بہار عمر
بزم رفتگاں ۱۰ار	دادا لال بجھکڑ ۸ر	دعائیں ۸ر	حور اور انسان ۱۲ار
گدڑی میں لال عمر	احکام نسواں عمر	چمنستان مغرب عمر	بساط حیات ۸ر
نالہ زار ۱۲ار	محسن حقیقی ۶ر	بلبل بیمار ۱۰ار	نشیب و فراز ۴ر
بے فکری کا آخری دن ۴ر			

ملنے کا پتہ :- دفتر عصمت دہلی

مصورِ غم علیہ الرحمۃ

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے)
شاہجہان آباد کے اُس مقتدر اور معزز خاندان کے فرزند رشید تھے جسے خاندان شاہان مغلیہ کے اُستاد
ہونے کا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا جس نے مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم مولوی عبد القادر
صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحر البیان مولوی عبد الوہاب مغفور بانی جامع مسجد
سہارنپور جیسے جید علماء اور قرآن و حدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے۔ یہ اُجڑے دیار کا وہ
وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظہ، حاجیہ، قاریہ ام عطیۃ النساء مرحومہ (چھوٹی
اُستانی جی) اور حاجیہ ام ذکیہ مرحومہ جیسی مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد
شمس العلماء مولوی نذیر حسین مرحوم "محدث دہلی" اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد
مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے۔ حضرت علامہ مغفور بمقام دہلی جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے،
اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ انکے والد ماجد مولوی حافظ عبد الواجد صاحب نے
حیدر آباد دکن میں جہاں وہ محکمہ بندوبست میں افسرِ اعلیٰ تھے، انتقال فرمایا، اور حضرت
علامہ مرحوم کی تعلیم و تربیت ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبد القادر صاحب مرحوم
اور خان بہادر مولوی عبد الحامد صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے اس لئے حضرت علامہ مغفور
نے اردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر
انھوں نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی مولوی نذیر احمد مرحوم (جو علامہ مرحوم
کے حقیقی پھوپھا تھے) اور مولانا حالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مغفور کی قابلیت کی
ترقی میں چار چاند لگا دیئے۔ ابھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ انکی ذہانت کا چرچا ہونے لگا
تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبد الرحیم صاحب بانی جامع مسجد جھجھر کی اکلوتی صاحبزادی
سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی۔ اور ۱۸۹۱ء میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت
شروع کی۔ مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی۔ اور دفتر کے خشک
کاموں میں جی نہ لگتا۔ پھر علامہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ روز

کے لئے گوارہ نہ کر سکتی تھیں ان وجوہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہ کی۔ اور ترقی کے نہایت معقول مواقع میسر آنے پر انکی طرف مطلق توجہ نہ فرمائی اور اناؤ کچہری، میرٹھ، علیگڈھ، دہرہ دون کی تبدیلی ہوتی رہی آخر دلی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبدیل ہوئے۔ مگر چند سال گذرے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں اٹھارہ انیس سال کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلی تصنیف حیات صالحہ یا "صالحات" ہے جو ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی ۱۸۹۸ء میں دوسری تصنیف منازل السائرہ ختم کی ان دونوں اصلاحی ناولوں کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ مغفور کا شہرہ ایک مقبول پایہ مصنف کی حیثیت سے بلند ہونا شروع ہوا ۱۹۰۳ء سے رسالہ "مخزن" میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے پھر "صبح زندگی" شائع ہوئی اور دلی کے باکمال ادیب کی طرز تحریر کی دلآویزی، زبان کی شیرینی، اور واقعات کے پیرایہ میں بیان کی دردانگیزی کی دھوم مچنے لگی ۱۹۰۸ء میں رسالہ "عصمت" جاری ہوا۔ جو ۲۸ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کا بہترین زنانہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے ۱۹۱۱ء میں حقوق نسواں کی حمایت میں رسالہ "تمدن" جاری کیا جو ۵ سال تک بڑی خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا ۱۹۱۵ء میں اخبار "سہیلی" جاری فرمایا مگر ۱۹۱۶ء میں دفتر عصمت میں قیامت کی آگ لگی اور سہیلی جاری نہ رہ سکا ۱۹۱۷ء میں شام زندگی شائع ہوئی اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پہلے ہی سال میں تین مرتبہ چھپی اور کتاب نے قوم سے حضرت علامہ مغفور کو مصور غم کا خطاب دلوایا اب اردو کے بےمثل مصنف نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا اور دو درجن کے قریب ضخیم کتابیں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۳ء تک کے زمانہ میں لکھ ڈالیں۔ جو مختلف حضرات نے شائع کیں۔ اور بقول مولانا تاجور "ڈیڑھ لاکھوں روپیہ پیدا کیا" حضرت مصور غم نے اپنی تصانیف کی جو مقبولیت دیکھی شاید اردو کے کسی مصنف کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ایک دو نہیں درجنوں کتابیں آٹھ آٹھ دس دس سال کے عرصہ میں دس دس بارہ بارہ دفعہ چھپیں۔ بلکہ "صبح زندگی" "شام زندگی" وغیرہ کے تو پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخری دو کتابیں "آمنہ کا لال"، "سیدہ کا لال" بھی چار ساڑھے چار سال میں ہزار ہا کی تعداد میں پانچ چھ دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں۔

۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اردو کورس علامہ مغفور سے صحیح کرائے۔ ۱۹۲۰ء میں نیشنل یونیورسٹی نے سب سے پہلا اردو ممتحن مقرر کیا ۱۹۲۷ء میں حکومت بہار و اڑیسہ نے شمالی ہند سے بہ حیثیت ماہر اردو کے اردو ہندی کی ترقی کے سلسلے میں حضرت علامہ مرحوم سے بیش بہا مشورے لئے

۱۹۲۲ء میں مسلمان بچیوں کے لئے تربیت گاہ بنات قائم کی جس سے ہندوستان کے مختلف حصوں کی سینکڑوں خوشحال اور یتیم و نادار بچیوں نے بحیثیت بورڈر تعلیم و تربیت حاصل کی اور جس سے ہزاروں غریب کم استطاعت بچیاں زیور تعلیم سے آراستہ ہوئیں اس مدرسہ کے لئے بیگم صاحبہ محترمہ کے ساتھ علامہ مغفور باوجود پیرانہ سالی کے ہندوستان کے کسی صوبہ کا سال میں مہینہ سوا مہینہ کا دورہ فرماتے تھے۔ مدرسے کے کاموں میں محترمہ بیگم راشد الخیری صاحبہ حضرت علامہ مغفور کی برابر کی شریک رہیں ۱۹۲۷ء میں مسلمان بچیوں کے لئے رسالہ "بنات" جاری فرمایا ۱۹۲۴ء میں علامہ مغفور کی مرحومہ بہو محترمہ خاتون اکرم کی یادگار میں زنانہ دستکاری کا رسالہ جوہر نسواں جاری ہوا حضرت علامہ راشد الخیری کی (خدا انہیں غریق رحمت فرمائے) خودداری بڑے آدمیوں اور بااثر و بارسوخ لوگوں سے ملنے جلنے کو کبھی درست نہ سمجھتی تھی۔ نام و نمود شہرت و خودنمائی جلسوں اور بے نتیجہ تقریروں سے سخت نفرت تھی کسی جلسہ یا کسی تحریک میں حصہ نہ لیتے تھے۔ حضرت مصور غم نے خاموشی کے ساتھ مسلسل چالیس سال تک تصانیف اور رسالوں کے ذریعہ خواتین ہند اور ادب اردو کی جو زبردست شاندار خدمات انجام دیں وہ اس قدر گراں بہا اور عظیم الشان ہیں کہ مشہور ادیبوں اور رہنمایان قوم کا فیصلہ ہے کہ انکی نظیر نہیں نکل سکتی۔ اصلاح نسواں اور حقوق نسواں کے لئے حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی کوششیں کبھی فراموش نہ ہوسکیں گی مصور غم ہی کی تحریروں سے عورتوں کی مظلومیت پر مردوں کے دل پسیجے مصور غم ہی کے لٹریچر سے عورتوں کو اپنی اصلاح و ترقی کا احساس پیدا ہوگیا۔ اور گذشتہ تہائی صدی میں خواتین ہند میں جو تھوڑی بہت بیداری پیدا ہوئی ہے متفقہ طور پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس میں بہت بڑا حصہ جنت نصیب حضرت علامہ راشد الخیری کی ان تھک مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ حضرت مصور غم علیہ الرحمۃ مشرق کے بے مثل حزن نگار مصنف ہی نہ تھے مزاحیہ مضامین لکھنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ناولسٹ بھی تھے، جرنلسٹ بھی اردو کے پہلے مختصر افسانہ نگار تھے اور مورخ بھی شاعر بھی تھے۔ اور انشا پرداز بھی۔ مگر ہر حیثیت میں مصلح اور نسوانی جذبات کے ترجمان۔ ان کی تحریروں کی طرح انکی تقریروں اور لکچروں میں بھی خدا نے کچھ ایسا اثر اور آواز میں کچھ ایسا درد عطا فرمایا تھا کہ مجمع زار و قطار آنسو بہاتا تھا۔ حضرت علامہ مغفور میں مذہبی عنصر بہت غالب تھا زمانۂ شباب میں علاوہ مذہب کے فارسی شاعروں اور انگریزی مصنفین کا بھی مطالعہ فرمایا تھا۔ حافظہ حیرت انگیز تھا۔ موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ انگریزی اور ہندوستانی بہت سے کھیل جانتے تھے۔ بدن کسرتی تھا جسم دوہرا قد لمبا، چہرہ پر جلالت اور [illegible] برستا تھا۔

خانگی زندگی انتہائی کامیاب تھی اور دیکھنے والوں کے لئے ہر حیثیت سے قابل رشک تھی بے نظیر بیٹے، لاجواب بھائی، سعادت مند داماد، بے مثل شوہر، عاشق زار باپ، اور بہترین دوست ہمیشہ شاداں وخنداں رہتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور زندہ دلی ان کے ملنے والے بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتے۔ جن کی قابلیت کا چار کھونٹ ڈنکا بج رہا تھا جن کی شہرت اس دور کے بڑے بڑے مصنفوں اور رہنماؤں کے لئے باعث رشک تھی، جن کا نام عزت کے ساتھ جن کا ذکر محبت کے ساتھ کیا جاتا تھا، ان کی شرافت اور اخلاق، سادگی اور وضعداری، مہماں نوازی اور انسانی ہمدردی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ ان کی عاجزی اور انکساری کا یہی ثبوت کچھ معمولی نہیں کہ ۶۰ کے قریب کتابیں زندگی میں شائع ہو گئیں لیکن کسی کتاب میں تصویر شائع نہ کرنے دی۔ کسی کتاب کو کسی کے نام منسوب نہ کیا۔ کسی کتاب میں کسی کی تقریظ جائز نہ سمجھی۔ تین چار کتابوں میں دیباچے بھی مجبوراً لکھے۔ ورنہ سوائے ٹائٹل پر نام آنے کے اپنا نام تک اپنی کتاب میں دوبارہ آنا پسند نہ فرمایا۔ صبر و شکر توکل و قناعت ہمیشہ شیوہ رہا۔ اپنی حالت میں بے انتہا خوش رہے۔ رحمدلی مخلصانہ عملی ہمدردی غیروں کی آگ میں کود پڑنا۔ دوسروں کے لئے سب کچھ لٹا دینا المختصر خدمتِ خلقُ اللہ حاصل عمر تھا۔ ۶۴ سال کی عمر تھی اور بظاہر صحت نہایت اچھی کہ دو ماہ بیمار رہ کر ۲۳ فروری کی منحوس صبح کو اُجڑے دیار کے آخری بال مصنف کا سایہ قوم بدبخت کے سر سے اُٹھ گیا۔ مصورِ غم کی رحلت پر ہندوستان بھر کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں کُہرام مچ گیا۔ جگہ جگہ زنانہ اور مردانہ ماتمی جلسے ہوتے اور ہندوستان کے باہر ادب اردو کا ذوق رکھنے والا ہر شخص دم بخود ہو گیا۔ جس قدر رنج و غم میں ڈوبے ہوئے مضامین جتنے مرثیے نوحے قطعات تاریخ المختصر جس قدر بلند پایہ ماتمی لٹریچر مصورِ غم کے انتقال پر شائع ہو گیا وہ اتنا ذبردست ہے کہ بقول ایڈیٹر "ملت" کسی ادیب بارہنما کی وفات پر اس وقت تک شائع نہ ہو سکا۔ آسمان کتنی ہی کروٹیں بدلے زمین کتنے ہی چکر کاٹے۔ ہندوستان بدلے ہندوستان والے بدلیں، معاشرت بدلے ادب بدلے، لیکن مصوّرِ غم حضرت علامہ راشد الخیری کو ہمیشہ عزت و محبت کے ساتھ یاد کیا جائے گا اور ان کا نام آنیوالی نسلیں فخر کے ساتھ لیتی رہیں گی۔ خدا کی بے شمار رحمتوں کے پھول اس مزار مبارک پر برستے رہیں جس میں وہ میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ اور خدا جنت نعیم میں اس پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے۔ جس کی دائمی مفارقت ہیں آٹھ آٹھ آنسو رلا رہی ہے۔

رازق الخیری

۲۲ جولائی ۳۶ء

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی تصانیف

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
آمنہ کا لال	عہ	گلدستۂ عید	۸ر	سراب مغرب	۸ر
سیدہ کا لال	عہ ۱۲ر	گرفتار قفس	۴ر	درِ شہوار	۸ر
الزہرا	۱۲ر	روداد قفس	۱۰ر	سات روحوں کے اعمالنامے	۸ر
عروسِ کربلا	عہ ۴ر	انگوٹھی کا راز	۶ر	قرآنی قصے	عہ
وداعِ خاتون	۵ر	تفسیر عصمت	۵ر	عروس مشرق	۱۰ر
شام زندگی	عہ	منظر طرابلس	۵ر	بزم رفتگان (با تصویر)	۱۰ر
صبح زندگی	عہ ۴ر	منازل ترقی	۴ر	گدڑی میں لال	عہ ۴ر
نوحہ زندگی	۱۲ر	سیلاب اشک (با تصویر)	عہ ۴ر	نالہ زار	۱۲ر
شب زندگی دو حصے	عالہ	جوہر عصمت	عہ ۴ر	بے فکری کا آخری دن	۴ر
محبوبۂ خداوند	۱۲ر	نانی عشو	۱۰ر	سیاحت ہند	عہ
نسوانی زندگی	۸ر	طوفانِ اشک	عہ ۴ر	گردابِ حیات	عہ
طوفانِ حیات	عہ	سودائے نقد	۵ر	دادا لال بجھکڑ	۸ر
حیات صالحہ	عہ ۸ر	ولایتی ننھی	۶ر	احکام نسواں	عہ
تمغۂ شیطانی	۱۲ر	بنت الوقت	۸ر	محسنِ حقیقی	۶ر
جوہر قدامت	عہ ۸ر	منازل السائرہ دو حصے	عالہ	مسلی ہوئی پتیاں	۶ر
یاسمین شام	عہ ۴ر	بچہ کا کرتہ	۴ر	داستانِ پارینہ (با تصویر)	۱۲ر
مؤودہ	۸ر	ابن کا دم واپسین	۴ر	دعائیں	۸ر
غدر کی ماری شہزادیاں	۱۲ر	شہنشاہ کا فیصلہ	۴ر	چمنستانِ مغرب	عہ
ستونتی	۷ر	وڈیا کی سرگزشت	۴ر	بلبلِ بیمار	۱۰ر
قلب حزیں	۸ر	فسانۂ سعید	۸ر	یادگارِ تمدن	۶ر
وداع ظفر (با تصویر)	عہ ۸ر	چہار عالم	۴ر	دلی کی آخری بہار	عہ
تیغ کمال	عہ	شہید مغرب	عہ	حور اور انسان	۱۲ر
بساطِ حیات	۸ر	محصول ڈاک بذمہ خریدار		نشیب و فراز	۴ر

حضرت علامہ مغفور کی یہ کتابیں نیز خواتین کے مطالب کی بہترین اردو کتب دفتر عصمت دہلی سے شائع ہوتی ہیں۔